آخری تحفہ

از قلم

فطرت نگار منشی پریم چند بی اے مرحوم

مصنف

گوشہ عافیت ۔ میدان عمل ۔ گئودان وغیرہ وغیرہ

ناشران

نرائن دت سہگل اینڈ سنز

تاجران کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

بار ششم

قیمت دو روپے آٹھ آنے

فہرست

مقبولیت

پہلا ایڈیشن	۱۲۰۰	اپریل ۱۹۳۸ء
دوسرا ایڈیشن	۱۵۰۰	مارچ ۱۹۳۹ء
تیسرا ایڈیشن	۱۰۰۰	نومبر ۱۹۴۰ء
چوتھا ایڈیشن	۱۰۰۰	اپریل ۱۹۴۲ء
پانچواں ایڈیشن	۱۵۰۰	اگست ۱۹۴۳ء
چھٹا ایڈیشن	۲۰۰۰	جنوری ۱۹۴۴ء

پریم چند

(از جناب محمود نظامی صاحب بی، اے)

اردو زبان کس قدر مظلوم ہے کہ اس میں یا تو اچھا ادیب پیدا ہی نہیں ہوتا یا پھر ہوتا ہے، تو وقت سے پہلے اٹھ جاتا ہے۔ پہلے دو تین سالوں میں اردو کے جو زبردست ارباب جلد ہی جلدی اٹھ گئے، اُن کی موت سے ہمارے ادب کو ایک المناک صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس قحط الرجال کے سمے میں منشی پریم چند جیسے عالی مرتبہ ادیب کا اٹھ جانا ہماری بہت بڑی ادبی بدبختی ہے۔ پریم چند کی موت سے گویا قصرِ اردو کا ایک بہت بڑا ستون گر گیا ہے۔ یہ ایک ایسا وطنی حادثہ ہے۔ جس کی تلافی مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔

پریم چند کی ذات جامع کمالات تھی، اس کے قلم سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو فیض پہنچتا رہا، چنانچہ اس وقت ٹھیک طور پر کہا نہیں جاسکتا کہ اس کے اٹھ جانے سے کون سی زبان کو زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ اردو ناول نویسی کے اس فرسودہ میدان میں جہاں افراط و تفریط کی وجہ سے اچھے اور بڑے انسانوں میں جو شے مابہ الامتیاز ہے نظر نہیں آتی۔ اگر کسی شخص نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی اور

بھٹکتے ہوئے ادبار کے سامنے ایک نیا نمونہ پیش کیا، تو وہ پریم چند ہے۔ یہ پریم چند ہی کا کمال ہے کہ اس کی تصنیفات کے طفیل ہمارا جمود ایک اضطراب میں تبدیل ہو رہا ہے اور اردو ناول ایک زندہ اور چلتی پھرتی مخلوق نظر آنے لگا ہے۔

پریم چند نے اپنے قلم سے دیو و پری کے قصے اور غیر فطری انسانوں کے افسانے سنانے کی بجائے معاشرت کی خامکاریوں پر تنقید کی، ہماری معاشرت مغربی شائستگی کے مجہول اثرات کی وجہ سے اب تک عجیب کش مکش میں پڑی ہوئی ہے۔ معاشرت کے کس نمونے کو ہم اپنا نمائندہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت اہم سوال ہے۔ عوام قدامت پسند ہیں۔ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ابھی تک افراتفری کے عالم میں ہے۔ اعلیٰ طبقہ مغربی تہذیب کی مدح سرائی میں اپنی روایات کا سرے سے منحرف ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ہمارے ناول کی عقبی زمین کس قدر کھوکھلی ہوگی۔ اس کے علاوہ ہمارا سیاسی تنزل ہماری قومی زندگی کے ایک سے زیادہ پہلوؤں پر حاوی ہے۔ خود ہماری اقتصادی اور معاشی حالت بھی ہمارے سماج کی کئی کمزوریوں کو مضبوطی کے ساتھ پاؤں جمانے میں مددگار ہے۔ اس صورت میں آسانی کے ساتھ ایک صحیح نصب العین قائم کرنا یقیناً بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستانی زندگی ناول کی مقتضی نہیں۔ ہمارے ہاں رہنے سہنے کا طریقہ رسوم و تہوار خاندانی خصوصیات، قومی روایات، نظریۂ زندگی، غرضیکہ کوئی چیز معین نہیں۔ خیالات کا رجحان اور طبائع کا میلان حد درجہ مختلف ہے۔ اور سب سے مقدم یہ کہ ہم میں صنفوں کے ارتباط و اختلاط میں بھی آزادی نہیں۔ اس صورت میں ناول کو ترقی ہوتی تو کیونکر دوسری طرف فرقہ وار خیالات ہم پر اس قدر مسلط ہیں کہ کسی مسلمان یا ہندو مصنف کے لئے ممکن نہیں کہ آزادی سے تذکرہ کر سکے، اور خواہ وہ کتنی ہی فراخ دلی سے غیر اقوام کے کرداروں کو پیش کرے۔

پھر بھی ممکن نہیں کہ اس پر تعصب کا الزام نہ لگے۔ مگر اسی ہمت شکن فضا میں رہ کر منشی پریم چند نے صحیح ناول نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی لازوال شہرت کسی اخباری ہنگامہ خیزی یا پراپیگنڈے کی شرمندۂ احسان نہیں۔ وہ جو کچھ ہے اپنی قابلیت اور عالمانہ استعداد کا نتیجہ ہے۔ اس نے اردو کی ایک فرسودہ صنف کے توسط سے ایک ناقدر ماحول میں رہ کر بھی جو کچھ کیا وہ ریاضِ اردو کے ایسے سدا بہار پھول ہیں۔ جنہیں امتداد زمانہ کی بادِ خزاں کے جھونکے کملا نہیں سکتے۔ یہ ایسے نقوش ہیں۔ جن کی آب و تاب گزرتے ہوئے وقت اور بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ ماند نہیں پڑ سکتی۔

پریم چند نے لفظی صناعیوں اور دلکشیوں پر توجہ دینے کی بجائے اور مفروضات اور نرے تخیلات کے مقابل میں جس طرح حقائق اور واقعاتِ زندگی کو موضوعِ تحریر بنایا وہ اس کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔ اس کی کتابیں نہ صرف ہمارے ناقص سماجی نظام کی مذمت کرتی ہیں۔ بلکہ قومیت اور وطنیت کے جذبے کی علمبردار بھی ہیں۔ اور پریم چند اپنے معاصرین کے برعکس اپنی کتابوں میں اپنے وطن کی وسیع دنیا کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اسی کے مسائلِ حاضرہ پر غور و فکر کر کے اسی کی روزمرہ زندگی کی پیچیدگیوں کے حل کی بہترین صورتیں پیش کرتا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنے ملکی ماحول معتقدات اور روایات کے درمیان رہ کر لکھا ہے۔ تاکہ اربابِ حل و عقد سنجیدگی کے ساتھ اس کی تحریروں پر غور کر سکیں۔

پریم چند کا یہ فکر اپنے ملک سے عشق ہے۔ اور وہ اس کی روایات کا بہت بڑا محافظ ہے۔ اس لئے وہ ضرور ایک حد تک قدامت پسند نظر آتا ہے۔ مگر اس کی قدامت پسندی جہالت کی حد کو نہیں پہنچتی۔ وہ مغربی تہذیب کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھی اس سے ہر وہ چیز قبول کرنے کے لئے تیار ہے

جس سے ہماری فطرت مسخ نہ ہو جائے۔ ہم اپنی اصلیت کو کھو نہ دیں۔

ہندوستان سے عشق رکھنے کی وجہ سے وہ کسانوں کا بھی سچا عاشق ہے چنانچہ اپنی کتابوں کے اوراق میں پریم چند نے کسانوں۔ مزدوروں۔ دیہاتیوں۔ اور ادنےٰ درجہ کے ملازمین کے جن مصائب کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اس قدر سچا اور اس قدر صحیح ہے کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا عکسی فوٹو دکھائی دیتا ہے۔ اس کے تمام کردار ہندوستانی ماحول کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ جو آپ کے سامنے اسی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ جس طرح آپ کو ہر روز اپنے شہر کی گلیوں اور بازاروں میں اُن سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی طرح پریم چند کے افسانوں کی مائیں۔ بہنیں۔ اور بیویاں بالکل ویسی ہیں۔ جن کے پاکیزہ جلووں سے ہندوستانی گھر معمور ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے ناولوں میں بعض اوقات پلاٹ کی کمزوری پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ناول آٹھ نو سو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور دو دو جلدیں تو کم وبیش ہر ایک کی ہیں۔ اسی طویل نویسی کی وجہ سے ان کے بعض حصوں میں پلاٹ کی وہ دلکشی مفقود ہو جاتی ہے۔ جو دوسرے مقامات میں نظر آتی ہے، مگر اس کے برعکس مختصر افسانوں میں یہ کمزوری سخت سے سخت نقاد کو بھی نظر نہیں آسکتی۔ ان کی کردار نویسی کا کمال بھی ان کی مختصر کہانیوں ہی میں نظر آتا ہے یہاں انہوں نے ذرا ذرا سی بات سے عجیب عجیب نتائج مرتب کئے ہیں۔ اور اپنے قلم کو نفسیات کے لطیف ترین مطالعہ احساسات کا مظہر بنایا ہے۔

پریم چند کی تمام تصنیفات کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی بہت سی ایسی باتیں جنہیں ہم آسان اور ناقابل توجہ سمجھتے ہیں۔ فی الحقیقت پیچیدہ اور دقیق مسائل سے بھری ہوتی ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں دنیا کی چیزیں بہت ہی کم کشش رکھتی ہیں۔ وہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو دیکھنے سے محروم

رہتے ہیں۔ اس لئے وہ اس دنیا میں رہ کر بھی اس دنیا سے الگ ہی رہتے ہیں لیکن اس طرح کے خوش قسمت لوگ بھی ہیں، جن کی آنکھ اور دل و دماغ ہر جگہ بیدار رہتا ہے۔ فطرت کے گوشے گوشے سے انہیں پیغام ملتا ہے، دنیا کی طرح طرح کی تحریکات ان کے دل کے ساز کو طرح طرح کے نغموں سے معمور کر دیتی ہیں۔

پریم چند اسی قسم کے انسانوں میں سے تھے۔ ان کی نگاہ دُور بین ہر چیز پر پڑتی تھی۔ اور اپنی ضرورت کی چیزیں اس میں سے چن لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انکی کہانیوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جسے ہم کئی مغربی مصنفین کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔

پریم چند کے ہاں ہماری معاشرت کی بلندی اور پستی دونوں نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں امراء اور رؤسا کا تذکرہ ہی نہیں۔ بلکہ راہ گیروں، سرائے والوں، کسانوں مزدوروں دیہاتیوں، چھوٹے چھوٹے شہروں میں رہنے والوں، غرض ہندوستان کے ہر قسم کے حقیر لوگوں کا حال بھی موجود ہے۔ بلکہ انہوں نے التزاماً کوشش کی ہے کہ ان کے ہر ناول کا پس منظر دیہات ہی رہے۔ اور سچ پوچھئے تو دیہات کی صحیح سپرٹ کو سمجھنے والا ان سے بہتر نہیں مل سکتا۔ اسی دیہاتی فضا کی وجہ سے پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے بھی بہت بڑے علمبردار ہیں۔ تعصب اور فرقہ داری کی جو فضا آج ہندوستان میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا پرتو دیہات میں نہیں پہنچا۔ اس پرسکون فضا میں ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے وہاں ہندو اور مسلمان پوری صلح اور آشتی سے اپنی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں۔ اور ان کی تمام روایات باہمی محبت اور رواداری کی آئینہ دار ہیں۔ اسی امن پسندی اور برادرانہ برتاؤ کا نقشہ آپ کو پریم چند کے افسانوں میں جگہ جگہ پر بکھرا ہوا ملیگا۔ جہاں ہندو مسلمان دیہاتی کچھ نہاد سرمایہ دار یا ظالم زمیندار کے مقابلے میں دو علیحدہ علیحدہ قومیں

نہیں بلکہ ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ شہروں میں آئے دن جو فرقہ وار سانحات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی جو گھناؤنی تصویر "پردہ مجاز" میں ملتی ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یقیناً کوئی شخص اسے اس سے بہتر پیرائے میں بیان کر کے اس سے عمدہ نتائج مرتب نہ کر سکتا تھا۔ پریم چند نے جو کچھ لکھا ہے۔ ان کی مختصر ترین کہانی سے لے کر ان کے طویل ترین ناول تک سب میں واقعات کا ایک ایسا سلسلہ ملتا ہے جس سے آخر تک میں کچھ خاص طرح کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ایسے افسانے نہیں جن کی عشق سے ابتدا ہوتی ہے۔ ہجران نصیبی پر سارے قصے کی بنا اور وصل پر ناول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور ناول نویس اس اخلاقی تعلیم کا جس کے لئے یہ سب کچھ لکھا گیا ہے۔ کہیں بھی ذکر نہیں کرتا۔ اور ناول پڑھنے کے بعد آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناولسٹ نے آپ کو کوئی خاص فلسفہ یا کوئی مخصوص نظریہ سمجھا دیا ہے۔ مگر پریم چند نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ایک خاص غرض اور ایک مخصوص غایت کی بنا پر ہے۔ "بازارِ حسن" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مصنف قارئین کے سامنے سماج کا ایک نہایت تاریک رُخ پیش کرتا ہے اور ملک کی عصمت فروشی کے اڈوں کی لعنت کے استیصال کے لئے قلم اٹھاتا ہے۔ "گوشۂ عافیت" میں آقا اور غلام۔ کسان اور زمیندار میں جو غیر فطری امتیاز ہے اس مکروہ واقعہ کی تذلیل کرتا ہے۔ "چوگانِ ہستی" میں وہ بتلاتا ہے کہ دیہات کے تباہ ہونے سے مجلسی زندگی کی تباہی اور بے راہ روی کا ابر کس طرح محیط ہوتا ہے۔ اور سرمایہ دار کے گھناؤنے مقاصد کے سامنے انسانیت کس طرح بے دست و پا ثابت ہوتی ہے۔ "میدانِ عمل" میں وہ بیان کرتا ہے۔ کہ صبر و استقلال کے سامنے استبداد اور جبر کو بالآخر کس طرح شکست ہوتی ہے۔ غرضیکہ پریم چند شروع سے آخر تک ایک واقعہ دہراتا ہے۔ جو چپکے چپکے آپ کے دل اور دماغ پر اپنا کام کرتا

رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ آپ کو اپنا ہمنوا کر لیتا ہے۔ اور آپ کے پاس اختلاف رائے کا موقعہ نہیں چھوڑتا۔

پریم چند کی عالمگیر کامیابی کا راز اس کی سیرت نگاری ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں عام مصنفین ہمیشہ ناکام رہ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کہ کسی شخصیت پر ماحول کا کیا اثر ہوتا ہے۔ روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کیونکر خیالات کو بدل دیتے ہیں۔ یا ان میں اور استواری پیدا کر دیتے ہیں۔ آپس کا نزاع، ملک و قوم کی تمدنی و معاشرتی حالت، مذہبیت کا جوش اور اقتصادی کیفیت سے سیرت کے نمونے کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ نیک چلن سے بدمعاش، رندمنش سے فرشتہ سیرت جنگجو سے صلح پسند اور وطن پرست سے ملک فروش ہونا، سب کچھ انسان کے لئے ممکن ہے۔ لیکن واقعات و ماحول تربیت و تعلیم سوسائٹی اور معاشرت کی تبدیلیاں ان کا باعث ہوتی ہیں۔ کردار نگاری میں ان کا اظہار، ان کا درجہ بدرجہ اثر دکھانا ضروری ہے۔ پھر ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر ایک کی طینت جدا، طبیعت علیحدہ، مزاج الگ، ان تمام امور کا خیال لازمی اور ضروری ہے۔ ایک ہی طرح کے واقعات دو مختلف شخصیتوں کو پیش آئیں۔ تو یقیناً ان کے نتائج، ان کے افعال و کردار ان کے خیالات بھی جداگانہ ہوں گے۔ لیکن ہمارے اردو ناولوں میں کردار ایک ہی قطع ایک ہی نمونے اور ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور افسانے کے تمام افراد کا کیرکٹر متعیّن ہوتا ہے۔ یا تو وہ فرشتہ ہے یا شیطان۔ مگر پریم چند کا کلیہ ہے کہ انسانی فطرت نہ بالکل سیاہ ہوتی ہے نہ بالکل سفید، اس میں دونوں رنگوں کا ایک عجیب اتصال و امتزاج ہوتا ہے۔ انسان حالات موجودہ کا محض ایک کھلونا ہے جو اس کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ "چوگان ہستی" میں سے راجہ مہندر کمار

اور گوشہ عافیت" میں سے مایا شنکر کی مثالوں کو لیجیے۔ غالباً پہلی نظر میں آپ ان دونوں کو نہایت اچھا آدمی سمجھتے ہیں۔ مگر جوں جوں افسانہ بڑھتا ہے۔ اور حالات بدلتے جاتے ہیں۔ ان کی سیرتیں منقلب ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا اولین اور آخری رنگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ پریم چند کے تمام کردار مکمل ہیں۔ اس کے افسانے کا ہر فرد اسی مادی دنیا کا باشندہ ہے۔ جنت کا فرشتہ یا دوزخ کا شیطان نہیں۔ ہر کردار میں چند خوبیاں بھی ہیں۔ اور کمزوریاں بھی۔ کسی میں خوبیاں زیادہ ہیں کسی میں خامیاں۔ مگر وہ نری خوبی یا محض بدی ہی کا مجموعہ نہیں۔ پریم چند کے متعلق یہ چیز یقیناً باعث حیرت ہے کہ انہوں نے اخلاق انسانی کی صحت سے زیادہ اس کی بیماریوں کی طرف توجہ کی ہے، اور ان کی نگاہ کا رجحان انسانی پستی کی طرف ہے، یعنی انہیں پڑھ کر ہم اس پستی سے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں۔ جس میں نادانی اور قسمت کی خرابی انسان کو گرفتار کر سکتی ہے۔ بہ نسبت اس بلندی کے جس پر اس کی فطرت کی پوشیدہ قوتیں اسے پہنچا سکتی ہیں۔ مگر پریم چند جن مفلس، مصیبت زدہ اور بدچلن انسانوں کا ہم سے تعارف کراتے ہیں۔ ان کی فطرت، غربت اور اس کی ملزومہ کمزوریوں کی زنجیروں میں اس بری طرح جکڑی ہوئی ہے کہ ان کے ماحول میں راہ راست پہ چلنے کی ترغیب دلانے والے اثرات کام نہیں کرتے۔ لیکن انسانیت کی اس عبرت انگیز بربادی میں بھی ایک روشنی کبھی کبھی نظر آجاتی ہے۔ جس پہ اگر ہم اپنی نظر قائم رکھ سکیں۔ تو پریم چند کے تمام ویرانے آباد معلوم ہونے لگتے ہیں اس کی بیماریوں میں صحت کے وہ تمام آثار اور مردوں میں زندگی کی وہ تمام علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ جو ہم کو یقین دلا دیتی ہیں کہ انسانیت کا شعلہ کمزور پڑ سکتا ہے۔ مگر اس کی چنگاری کبھی بجھ نہیں سکتی۔ پریم چند نے انسانیت کا جو

جوہر دریافت کیا ہے، وہ انسانی ہمدردی ہے۔ اور اس کی مدد سے وہ زندگی کی تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر کے دکھا دیتا ہے۔ پریم چند انسان کی فطرت کے متعلق بہت بلند رائے رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ فطری بلندی انسان سے بآسانی زائل نہیں ہوتی۔ اس کی سیرت منقلب ہونے پر بھی اپنی صلاحیت نہیں کھوتی۔ پریم چند کے ناول اپنے نتائج کے لحاظ سے عبرت کی تصویر نہیں، جو ہمارے سامنے دوسروں کی حماقتیں ایک غیبی تنبیہہ کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ بلکہ اس عبرت کا مرقع ہیں جو ہمارے دلوں کو انسانی ہمدردی کی جولانگاہ محبت اور ایثار کا سرچشمہ بننے کا حوصلہ دلاتی ہے جس سے فطرت میں وسعت، دل میں درد، اخلاق میں محبت اور ہمدردی پیدا ہو۔ گو پریم چند کے کئی اصول پہلی نظر میں مبالغہ آمیز جہاں فراموشی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم زیادہ غور کریں۔ تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ یہ کوئی دیدہ و دانستہ خیال آرائی نہیں۔ نہ ایسی جدت پسندی جو حد سے اس قدر تجاوز کر گئی ہے کہ مہمل یا ناگوار ہو جاتے۔ مثلاً پریم چند کا نظریہ ہے کہ اپنے تعلیمی اور افادی اثرات کی وجہ سے انسان کے لئے غصہ اور حسد، کذب و دغا جعل و فریب بھی ضروری ہیں۔ وہ ضبط نفس کا قائل نہیں۔ ضبط اور احتیاط خلقی نشو و نما میں مانع ہیں۔ وہی پودا تناور درخت ہو سکتا ہے، جو صبا اور سموم، مینہ اور اولے خشکی اور تری میں یکساں کھڑا رہے۔ اس کے لئے سموم اتنی ہی ضروری ہے۔ جتنی صبا۔ خشکی اتنی ہی حیات پرور جتنی تری۔ اسی طرح تکمیل نفس کے لئے بھی نیرنگی تجربات لازمی ہیں۔ یہاں تک کہ کذب و دغا میں بیش بہا تعلیمی اثرات پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ تجربات سے سیرت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب و تکمیل ہوتی ہے۔ درحقیقت پریم چند کو اپنے تجربے کے دوران میں جو ناگوار باتیں دریافت ہوتی ہیں۔ ان کے اعلان کرنے میں اس نے مطلق تکلف نہیں کیا، اور اس نے اس خیال پر بھی وقت ضائع نہیں

کیا کہ دنیا کیا کہے گی، اور کیا سمجھے گی۔ مثلاً غریبی امیری کے غیر فطری امتیاز کا بہت بڑا دشمن ہونے کے باوجود افلاس کو مارِ سیاہ سمجھتے ہوئے بھی پریم چند اسے تکمیل نفس کے لئے تمدن سے کہیں زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک یہ انسان میں مضبوط ارادہ عزمِ کامل، ہمدردی اور دلسوزی پیدا کرتا ہے۔ سچ پوچھئے۔ تو ایسی ہی ناگوار باتوں کو معلوم کرکے ہم اپنی فطرت کی اندرونی کیفیات کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور کیرکٹر، اخلاق اور اعمال کے پیچیدہ معمّے آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔ پریم چند کے تجربات نہایت تلخ ہیں۔ اس کا فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ کائنات نہ صرف بہت معیّن اور بہت با اثر ہے۔ بلکہ بہت نرالا بھی۔ مثلاً اس کا تجربہ ہے کہ اس کارزارِ ہستی میں مذہب اور اخلاق ہی پر ہر چیز کا انحصار نہیں۔ یہاں مکر و فریب اور دغا بھی جائز ہیں۔ بشرطیکہ ان سے مطلب پورا ہوتا ہو۔ یہاں کام کے جا اور بے جا ہونے کا فیصلہ کامیابی کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اگر جیت گئے تو سارے دھوکے اور مغالطے مساعدت کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہمارے کام کی تعریف ہوتی ہے اگر ہار گئے۔ تو انہیں گناہ کہا جاتا ہے۔ غرضیکہ انہیں تجربات کی روشنی میں اپنے افسانے کے کردار آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور آپ ان میں زندگی کے متحرک آثار کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

دراصل پریم چند نے یہ تمام کتابیں ہندوستانی کسانوں کے دُکھ درد سے ہی بے قرار ہو کر ان کے غموں، تمناؤں اور ان کی امیدوں کی داستان کے طور پر لکھی ہیں گوشۂ عافیت میں حسن و عشق کی ایک نہایت دلپذیر داستان ہے۔ جو گاؤں کے رئیس اور اس کی سالی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں افعال و واقعات کو سمجھانے کے لئے ان کے اسباب و علل سے جس طرح بحث کی ہے، وہ پریم چند کے علم النفس کے ماہر ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن پریم چند کا کمال یہاں نہیں اس

کے فن کی تکمیل وہاں ہوتی ہے۔ جہاں وہ اسی کہانی میں سکھو، بلراج، لکھمن، بھگتا، منوہر، قادر میاں، غوث خاں کو دکھاتا ہے۔ ربیع کی فصل، بیگار کے جھگڑوں اور عدالتی کارروائیوں کا دلسوز قصہ بیان کرتا ہے۔ کیونکہ پریم چند کی طبیعت کا جوہر دیہات کے تذکرے ہی میں کھلتا ہے۔ گوشۂ عافیت کے حاجی پور میں چلے جائیے۔ یا چوگان ہستی کے پانڈے پور میں آپ کو وہاں کی سادہ اور پاکیزہ جھونپڑیوں کی بے سروسامانی میں ایک روحانی اطمینان اور ایک سرمدی سکون میسر آ جائے گا۔ یہاں کے مظلوم اور بے کس رہنے والوں کے معصوم چہروں پر ان کے مصائب کے مقابل میں مسرت کا ایک روح پرور تبسم کھیلتا ہوا دکھائی دے گا۔ یہی پریم چند کے ارمانوں کی دنیا ہے۔ جسے وہ کارخانوں اور ملوں کے مہلک دھوئیں میں مستور ہونے نہیں دے سکتا۔ جس کا تحفظ وہ انسانیت اور انسانی اخوت کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

پریم چند کی نظروں میں کسان اور مزدور بہت عزت کے مالک ہیں، چنانچہ اس کے نزدیک ہمیں غریبوں کے اس طبقہ کو قابل نفرت سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہم جو شب و روز رشوتیں لیتے ہیں۔ سود کھاتے ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ بے کسوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ ہرگز اس قابل نہیں کہ جمہور کے کسی حصے کو حقیر سمجھیں۔ سب سے ذلیل تو ہم ہیں سب سے بڑے گنہگار اور بدکار خود ہم ہیں۔ جو اپنے تئیں مہذب ممتاز منور اور مرتفع سمجھتے ہیں۔ مگر کسی کے کام نہیں آ سکتے۔ اسی طرح ہم میں سے کسی دوسرے کو غلام کہنے کا بھی حق نہیں اندھوں کی بستی میں کون کسی کو اندھا کہے گا۔ ہم سب کے سب امیر ہوں یا غریب۔ راجہ ہوں یا فقیر غلام ہیں۔ ہم اگر جاہل مفلس گنوار ہیں۔ تو کم درجے کے غلام ہیں۔ ہم اپنے رام کا نام لیتے ہیں۔ اپنی گئو کے پوجتے ہیں۔ اپنی گنگا میں اشنان کرتے ہیں، اپنی بولی

بولتے ہیں، اپنی دھوتی باندھتے ہیں۔ اور اگر ہم تعلیم یافتہ صاحب ثروت اور بیدار ہیں، تو بہت بڑے غلام ہیں، پتلون پہنتے ہیں۔ بدیسی زبان بولتے ہیں، کُتّے پالتے ہیں، ٹب میں نہاتے ہیں، اور اپنے بھائیوں کو حقیر سمجھتے ہیں، غلامی صرف روح سے تعلق رکھتی ہے۔ موٹر، بنگلے، پولو اور پیانو یہ سب لوہے کی بیڑیاں ہیں جنہوں نے ان کو نہیں پہنا وہی سچی آزادی کا لطف حاصل کر رہے ہیں۔ جو اپنے قومی لباس اور قومی معاشرت کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہیں۔ ہم جو مہذب اور روشن خیال بنتے ہیں، لوہے کی بیڑیاں پہن کر اپنی روحانی آزادی کو ہاتھ سے کھو کر کسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ انہیں قابل رحم خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم خود قابل رحم ہیں۔ جو صاحب بہادر کے بنگلوں پر جبیں سائی کرتے ہیں۔ خانساموں کے ناز اٹھاتے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں لئے در بدر گھومتے ہیں۔ کیا کسانوں کو بھی کسی نے یہ بیہودہ حرکتیں کرتے دیکھا ہے۔

پریم چند کے کارناموں میں سب سے نمایاں شئے اس کی سیرت نگاری کے علاوہ اس کا اچھوتا انداز بیان ہے جس سے پڑھنے والے کے سامنے بالکل تصویر سی کھنچ جاتی ہے۔ دلکش انداز بیان سے پریم چند نے اپنے مفہوم کو واضح کرنے میں بہت مدد لی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کی خوبی یہ بھی ہے۔ کہ اس نے جس طبقے کے افراد کو پیش کیا ہے۔ ان ہی کی زبان میں ان کا مکالمہ ادا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس خوبی کی وجہ سے ان کی تصنیفات میں اپنی جدت زور بیان، سادگی طبقہ کی زبان پر جو پورا قابو حاصل ہے۔ وہ تو خیر ہے ہی۔ لیکن اس کے علاوہ جو زبان دیہاتیوں کی استعمال کرتے ہیں۔ وہ بہت سادہ اور برمحل ہوتی ہے۔ اور اپنی صفائی کی وجہ سے ہیرے اور جواہر کی طرح ان کی تصنیفات میں جڑی ہوئی نظر آتی ہے، بعض معترضین کو پریم چند کی سلیس سادہ عام فہم زبان پر اس لحاظ سے اعتراض ہے کہ انہوں نے

دیہاتی محاوروں اور الفاظ از قسم وصولنس او بیل وغیرہ کو بطور تحریک کے زبان میں شامل کر لیا ہے۔ لیکن بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا۔ کہ یہ خامی درحقیقت خوبی ہے۔ افسانہ نگاری کے لیے سلیس اور عام فہم زبان ہی بہترین ہو سکتی ہے۔ پریم چند کی بے پناہ قوت تخلیق کا راز اسی سلیس اور عام فہم زبان میں پنہاں ہے۔ یوں بھی وہ اردو کیا کہ جب تک قاموس و لغات داہنے بائیں تشریف فرما نہ ہوں۔ تحریر کا معنی مدعا سمجھ ہی میں نہ آسکے۔ وصولنس یا اسی قسم کے دیگر الفاظ کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر لفظ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کی خوبی یا برائی کا انحصار استعمال کرنے والے کے ذوق پر ہے۔ لفظ بذات خود نہ بھلا ہے، نہ برا ہے۔ ایک اچھے سے اچھے لفظ کا بے محل استعمال اُسے ناگوار اور برا بنا دیتا ہے ایک معمولی اور عامیانہ لفظ کا صحیح اور باموقع استعمال عبارت میں خاص شان پیدا کر دیتا ہے۔ عامیانہ بول چال کو حقارت سے دیکھنا عالمانہ خود پسندی کی علامت ہے۔ یہی عام بول چال زبان کا سرچشمہ اور قوت ہے جس سے وہ ہر وقت غذا اور تقویت حاصل کرتی رہتی ہے۔ زبان کو عام انسانی معاشرت اور حالات سے دوش بدوش رہنا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں لازمی ہے کہ وہ عوام کی بول چال سے فیض حاصل کرتی رہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ پریم چند کا بہت بڑا احسان اردو پر یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے نچلے طبقے کے ایسے الفاظ اور محاورات جو صرف بول چال میں زبانوں پر تھے۔ ادبی زبان میں داخل کر دیئے، ان سے زبان کی رونق دوبالا ہوگئی۔ اور بہت ہی قابل تحسین بھی، اس اعتراض سے قطع نظر معنوی طور پر پریم چند کی کتابیں ایک خاص درس حیات، ایک ٹھوس لائحہ عمل آپ کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ پریم چند ہماری روزمرہ کی زندگی کے واقعات کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے۔ جس میں وہ اپنے فن کی بوقلمونی سے افسانوی ماحول

اور کرداروں کے تمام اسقام و اوصاف نقش کرنے کے بعد ایک نصب العین واضح کر دیتا ہے۔ مگر وہ آپ کو ہماری سوسائٹی کے نقائص اور ہمارے سماجی نظام کی کمزوریوں کو دکھا کر مایوسی کی ظلمت آفریں آبادی میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑتا، بلکہ وہ ان کے نقائص کے ساتھ ان کی اصلاح کی عملی تشکیل بھی بتلاتا ہے۔ غرضکہ پریم چند ہماری زبان اور ادب ہی کا محسن نہیں بلکہ اس کے احسانات ہمارے ملک کے لاتعداد افراد اور اشخاص پر بھی ہیں۔ جن کی ترجمانی کے لئے اس نے اپنے بے پناہ قلم کو جنبش دی اور جن کی حمایت میں وہ زندگی بھر مخالف عناصر سے مردانہ وار جنگ کرتا رہا۔ بابو راجندر پرشاد نے پریم چند کے اندوہناک سانحہ ارتحال پر کیا خوب فرمایا ہے

"جب میں ان کی تصانیف کا خیال کرتا ہوں تو مجھے ان میں انسانی زندگی کے دردناک غموں کی جیتی جاگتی تصویر ملتی ہے۔ ان کی تصانیف پڑھنے والا اوپر ہی اٹھتا ہے نیچے نہیں گرتا۔ پریم چند جی ان مصنفین میں سے نہیں تھے۔ جو دوسروں کے کپڑے پہن کر اپنی شان بڑھاتے ہیں۔ دوسروں سے ادھار مانگ کر اپنا رُعب دکھاتے ہیں۔ پریم چند جی کی شان ان کی اپنی شان ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اُن کا طبعزاد ہے۔ اتنی شان والے پریم چند جی ایسے بلند معیار ادیب اور اس قدر سچے انسان تھے۔ پھر بھی جیتے جی ان کی قدر نہیں ہوتی۔ کیا یہ آنسو بہانے کی بات نہیں؟

مجھے تو ان کی تصانیف میں درد کی تصاویر ملتی ہیں۔ اپنے قلم کی نوک سے وہ ہمیشہ کاغذ پر درد کی تصویریں اس طرح نقش کر دیتے ہیں۔ کہ ان کے ساتھ اُن کے قارئین کو رونا پڑتا ہے۔ یہی ان کی خصوصیت تھی۔ مگر خود ان کی زندگی کچھ کم رلانے والی اور کچھ کم دردناک نہیں۔"

محمود نظامی

آخری تحفہ

سارے شہر میں صرف ایک ایسی دکان تھی، جہاں ولایتی ریشمی ساڑھی مل سکتی تھی، اور سبھی دکانداروں نے ولایتی کپڑے پر کانگریس کی مہر لگوائی تھی۔ مگر امرناتھ کی محبوبہ کی فرمائش تھی، اس کی تعمیل ضروری تھی۔ وہ کئی دن تک شہر کی دکانوں کا چکر لگاتے رہے دوگنا دام دینے پر تیار تھے۔ لیکن کہیں مقصد پورا نہ ہوا۔ اور اس کے تقاضے شدید سے شدید تر ہوتے جاتے تھے۔ ہولی آ رہی تھی۔ آخر وہ ہولی کے دن کونسی ساڑھی زیب تن کرے گی۔ اس کے روبرو اپنی معذوری کا اظہار امرناتھ کی مردانہ خودداری کے لئے محال تھا۔ اس کے اشارہ سے وہ آسمان کے تارے توڑ لانے کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے۔ آخر جب کہیں مقصد برآری نہ ہوئی، تو انہوں نے اسی خاص دکان پر جانے کا ارادہ کیا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ اس دکان پر دھرنا دیا جا رہا ہے۔ صبح سے شام تک رضاکار تعینات رہتے ہیں۔ اور تماشائیوں کا بھی ہر دم خاصا مجمع رہتا ہے۔ اس لئے اس دکان میں جانے کے لئے ایک خاص صنف کی اخلاقی ہمت درکار تھی۔ اور یہ ہمت امرناتھ میں ضرورت سے کم تھی۔ تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ قومی جذبات سے بھی عاری

نہ تھے حتی الامکان سودیشی چیزیں ہی استعمال کرتے تھے۔ مگر اس معاملہ میں بہت راسخ نہ تھے۔ سودیشی مل جائے تو بہتر ورنہ بدیشی ہی سہی۔ اس اصول کے پیرو تھے، اور خاص کر جب اس کی فرمائش تھی۔ تب تو کوئی مفر ہی نہ تھا۔ اپنی ضروریات کو تو وہ شاید کچھ دنوں کے لئے ملتوی بھی کر دیتے۔ مگر اس کی فرمائش تو مرگِ بے ہنگام ہے۔ اس سے نجات کہاں ممکن؟ طے کر لیا کہ آج ساڑھی ضرور لائیں گے۔ کوئی کیوں روکے؟ کسی کو روکنے کا کیا مجاز ہے؟ مانا، سودیشی کا استعمال احسن ہے۔ لیکن کسی کو جبر کرنے کا کیا حق ہے؟ اچھی جنگِ آزادی ہے جس میں شخصی آزادی کا اتنی بے دردی سے خون ہو۔ یوں دل کو مضبوط کر کے وہ شام کو دکان پر پہنچے۔ دیکھا تو پانچ رضاکار پکٹنگ کر رہے ہیں۔ اور دکان کے سامنے سڑک پر ہزارہا تماشائی کھڑے ہیں۔ سوچنے لگے۔ دکان میں کیسے جائیں۔ کئی بار کلیجہ مضبوط کیا۔ اور چلے مگر برآمدہ تک جاتے ہمت نے جواب دے دیا۔

اتفاق سے ایک جان پہچان کے پنڈت جی مل گئے۔ ان سے پوچھا:۔

"کیوں جناب یہ دھرنا کب تک رہے گا؟ شام تو ہو گئی!"

پنڈت جی نے فرمایا "ان سر پھروں کو صبح اور شام سے کیا مطلب؟ جب تک دکان بند نہ ہو جائے گی، یہاں سے نہ ٹلیں گے۔ کہئے کچھ خریدنے کا ارادہ ہے؟ آپ تو بدیشی کپڑا نہیں خریدتے۔"

امرناتھ نے زودرنج انداز سے کہا "میں تو نہیں خریدتا۔ مگر مستورات کی فرمائش کو کیسے ٹالوں؟"

پنڈت جی نے مسکرا کر کہا "واہ! اس سے زیادہ آسان تو کوئی بات نہیں عورتوں کو بھی حکمہ نہیں دے سکتے۔ سو حیلے اور ہزار بہانے ہیں۔"

امرناتھ: "آپ ہی کوئی حیلہ سوچیے۔"

پنڈت جی: "سوچنا کیا ہے۔ یہاں رات دن یہی کیا ہی کرتے ہیں۔ سو پچاس حیلے ہمیشہ جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ عورت نے کہا ہار بنوا دو۔ کہا آج ہی لو۔ دو چار روز کے بعد کہا سنار مال لے کر چمپت ہو گیا۔ یہ تو روز کا دھندا ہے بھائی۔ یہاں مستورات کا کام فرمائش کرنا ہے۔ مردوں کا کام اسے خوبصورتی سے ٹالنا ہے۔"

امرناتھ: "آپ تو اس فن کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔"

پنڈت جی: "کیا کریں بھائی صاحب آبرو تو بچانی ہی پڑتی ہے۔ سوکھا جواب دیں تو شرمندگی الگ ہو، خفگی الگ۔ وہ سمجھیں ہماری پروا ہی نہیں کرتے۔ آبرو کا معاملہ ہے۔ آپ ایک کام کیجیے۔ یہ تو آپ نے کہا ہی ہوگا کہ آج کل پکٹنگ ہے۔"

امرناتھ: "ہاں یہ عذر تو کر چکا برادر، مگر وہ سنتی ہی نہیں۔ کہتی ہیں کیا ولایتی کپڑے دنیا سے اٹھ گئے، مجھ سے چلے ہو اڑنے۔"

پنڈت جی: "تو معلوم ہوتا ہے کوئی دشمن کی بچی عورت ہے۔ تو میں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک خالی کارڈ کا بکس لے لو۔ اس میں پرانے کپڑے جلا کر بھر لو۔ جا کر کہو دنیا میں کپڑے لیے آتا تھا۔ والنٹیروں نے چھین کر جلا دیے۔ کیوں کیسی رہے گی؟"

امرناتھ: "کچھ جچتی نہیں۔ ابھی ہیں اعتراض کریں گی۔ کہیں پردہ فاش نہ ہو جائے تو مفت کی خفت ہو۔"

پنڈت جی: "تو معلوم ہو گیا کہ آپ بودے آدمی ہیں۔ اور ہیں بھی آپ کچھ ایسے ہی۔ یہاں تو کچھ اس شان سے حیلے کرتے ہیں کہ حقیقت بھی اس کے سامنے گرد ہو جائے۔ زندگی بھر یہی بہانے کرتے گزری اور کبھی گرفتار نہ ہوئے۔

ایک ترکیب اور ہے، اسی نمونہ کا دیسی مال لے جائیے اور کہہ دیجئے کہ ولائتی ہے۔"

امرناتھ: "دیسی اور ولائتی کی تمیز انہیں مجھ سے اور آپ سے کہیں زیادہ ہے ولائتی پر تو جلد ولائتی کا یقین نہ آئے گا۔ دیسی کی تو بات ہی کیا ہے۔"

ایک کھدر پوش صاحب قریب ہی کھڑے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ بول اٹھے: "اے صاحب، سیدھی سی تو بات ہے، جا کر صاف کہہ دیجئے کہ میں بدیشی کپڑے نہ لاؤں گا۔ اگر ضد کرے تو دن بھر کھانا نہ کھائیے۔ آپ راہِ راست پر آجائیں گی۔"

امرناتھ نے ان کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں آپ اس کوچہ سے ناآشنا ہیں اور بولے "یہ آپ ہی کر سکتے ہیں، میں نہیں کر سکتا۔"

کھدر پوش: "کر تو آپ بھی سکتے ہیں۔ لیکن کرنا نہیں چاہتے، یہاں تو اُن لوگوں میں سے ہیں کہ اگر بدیشی دُعا سے نجات ملتی ہو۔ تو اسے بھی ٹھکرا دیں۔"

امرناتھ: "تو شاید آپ گھر میں پکٹنگ کرتے ہوں گے؟"

کھدر پوش: "پہلے گھر میں کر کے تب باہر کرتے ہیں۔ بھائی صاحب!"

کھدر پوش صاحب چلے گئے۔ تو پنڈت جی بولے "یہ صاحب تو تیس مار خاں سے بھی تیز نکلے۔ اچھا تو آپ ایک کام کیجئے۔ اس دکان کی پشت پر ایک دوسرا دروازہ ہے۔ ذرا اندھیرا ہو جائے، تو اُدھر سے چلے جائیے گا۔ دائیں بائیں کسی طرف نہ دیکھئے گا۔"

امرناتھ نے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا۔ اور جب اندھیرا ہو گیا تو دکان کے پشت کی جانب جا پہنچے۔ ڈر رہے تھے کہ کہیں یہاں بھی محاصرہ نہ ہو۔ لیکن میدان خالی تھا۔ لپک کر اندر گئے۔ ایک بیش قیمت ساڑھی خریدی اور باہر نکلے تو ایک دیوی جی زعفرانی ساڑھی پہنے کھڑی تھی۔ ان کی روح فنا ہو گئی، دروازہ

سے باہر پاؤں رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک منٹ تک تو کواڑ کی آڑ میں چھپے کھڑے رہے پھر دیوی جی کا رُخ دوسری طرف دیکھ کر تیزی سے نکل پڑے اور کوئی سو قدم بھاگتے ہوئے چلے گئے۔ شامت اعمال سامنے سے ایک بڑھیا لٹھیا ٹیکتی چلی آرہی تھی۔ آپ اس سے لڑ گئے۔ بڑھیا گر پڑی۔ اور لگی بد دعائیں دینے "ارے مردوے! یہ جوانی بہت دن نہ رہے گی۔ آنکھوں میں چربی چھا گئی ہے۔ دھکے دیتا چلتا ہے۔" امرناتھ اس کی خوشامدیں کرنے لگے "ماتا معاف کرو۔ مجھے رات کو کچھ کم نظر آتا ہے۔ عاینک گھر بھول آیا۔" بڑھیا کا مزاج ٹھنڈا ہوا، آگے بڑھی۔ آپ بھی چلے۔ دفعتاً کانوں میں آواز آئی "بابو صاحب ذرا ٹھہریئے گا۔" اور وہی زعفرانی کپڑوں والی دیوی جی آتی ہوئی دکھائی دیں، امرناتھ کے پاؤں بندھ گئے۔ اس طرح کلیجہ مضبوط کر کے کھڑے ہو گئے۔ جیسے کوئی طالب علم ماسٹر کی بید کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

دیوی جی نے قریب آکر کہا "آپ تو ایسا بھاگے کہ میں گویا آپ کو کاٹ کھاؤں گی۔ آپ جب پڑھے لکھے آدمی ہو کر اپنا فرض نہیں پہچانتے۔ تو افسوس ہوتا ہے۔ ملک کی کیا حالت ہے۔ لوگوں کو کھدر نہیں ملتا۔ آپ ریشمی ساڑھیاں خرید رہے ہیں۔"

امرناتھ نے شرمندہ ہو کر کہا "میں سچ کہتا ہوں۔ دیوی جی میں نے اپنے لئے نہیں خریدی ہے۔ ایک صاحب کی فرمائش تھی۔"

دیوی جی نے جھولی سے ایک چوڑی نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ایسے حیلے روز ہی سنا کرتی ہوں۔ یا تو آپ اسے واپس کر دیجئے یا لائیے ہاتھ، میں آپ کو چوڑی پہنا دوں۔"

امرناتھ "شوق سے پہنا دیجئے۔ میں اسے بڑے فخر سے پہنوں گا۔ چوڑی اُس

قربانی کی ایک علامت ہے۔ جو دیویوں کی زندگی کے لئے مخصوص ہے۔ چوڑیاں ان دیویوں کے ہاتھ میں بھی تھیں۔ جن کے نام سن کر آج بھی ہم تعظیم سے سر جھکاتے ہیں۔ میں تو اسے شرم کی بات نہیں سمجھتا۔ آپ اگر اور کوئی چیز پہنانا چاہیں۔ تو وہ بھی شوق سے پہنا دیجئے۔ عورت پرستش کی چیز ہے۔ حقارت کی چیز نہیں۔ اگر عورت جو قوم کو پیدا کرتی ہے۔ چوڑی پہننا باعث فخر سمجھتی ہے تو مردوں کے لئے چوڑی پہننا باعث شرم کیوں ہو؟"

دیوی جی کو ان کی اس بے غیرتی پر حیرت تو ہوئی۔ مگر وہ اتنی آسانی سے امرناتھ کو چھوڑنے والی نہ تھی۔ بولی " آپ باتوں کے شیر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ دل سے عورت کو پرستش کی چیز مانتے ہیں۔ تو میری یہ استدعا کیوں نہیں مان جاتے؟"

امرناتھ :- "اس لئے کہ یہ ساڑھی بھی ایک عورت کی فرمائش ہے؟"

دیوی :- "اچھا چلئے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ ذرا دیکھوں، آپ کی دیوی جی کس مزاج کی عورت ہے؟"

امرناتھ کا دل بیٹھ گیا۔ غریب ابھی تک بن بیاہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ان کی شادی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ شادی کو وہ ایک قید ذلیل سمجھتے تھے۔ مگر آدمی رنگین مزاج تھے۔ تاہل سے محترز ہو کر بھی تاہل کی دل فریبیوں سے بے نیاز نہ تھے۔ کسی ایسے وجود کی ضرورت ان کے لئے لازمی تھی۔ جس پر وہ محبتوں کو نثار کر سکیں۔ جس کی طراوت سے وہ اپنی خشک زندگی کو تر و تازہ کر سکیں۔ جس کے سایۂ الفت میں وہ ذرا دیر کے لئے ٹھنڈک پا سکیں جس کے دل میں وہ اپنی امڈی ہوئی جوانی کے جذبات بکھیر کر ان کا اُگنا دیکھ سکیں۔ ان کی نظر انتخاب مالتی پر پڑی تھی۔ جس کی شہر میں دھوم

تھی۔ ادھر ڈیڑھ دو سال سے وہ اسی خرمن کے خوشہ چین بنے ہوئے تھے۔ دیوی جی کے اصرار نے انہیں ذرا دیر کے لئے پیچ و تاب میں ڈال دیا۔ ایسی ندامت انہیں زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ بولے "آج تو وہ ایک تقریب میں گئی ہوئی ہیں گھر میں نہ ہوں گی"

دیوی جی نے بے اعتباری سے ہنس کر کہا "تو میں سمجھ گئی" یہ آپ کی دیوی جی کا قصور نہیں، آپ کا قصور ہے"

امرناتھ نے خفیف ہو کر کہا "میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ آج وہ گھر پر نہیں ہیں"

دیوی نے پوچھا "کل آجائیں گی؟"

امرناتھ بولے "ہاں کل آجائیں گی"

دیوی "تو آپ یہ ساڑھی مجھے دے دیجئے اور کل یہیں آجائیے گا۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ میرے ساتھ دو چار بہنیں بھی ہوں گی"

امرناتھ نے بے عذر وہ ساڑھی دیوی جی کو دے دی اور بولے "بہت خوب میں کل آجاؤں گا۔ مگر کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ جو ساڑھی کی ضمانت درکار ہے؟"

دیوی جی نے مسکرا کر کہا "سچی بات تو یہی ہے کہ مجھے آپ پر اعتبار نہیں ہے"

امرناتھ نے خودداری کے ساتھ کہا "اچھی بات ہے۔ آپ اسے لے جائیں"

دیوی نے ایک لمحہ کے بعد کہا "شاید آپ کو ناگوار گزر رہا ہو کہ کہیں ساڑھی گم نہ ہو جائے۔ اسے آپ لیتے جائیے۔ مگر کل آئیے ضرور"

امرناتھ کو ایسی غیرت آئی کہ بغیر کچھ کہے گھر کی طرف چل دیئے۔ دیوی جی

"لینے جاہیے، لینے جاہیے" کرتی رہ گئی۔

(۳)

امرناتھ گھر جاکر ایک کھدر کی دکان پر گئے۔ اور دو سوٹوں کا کھدر خریدا اور اپنے درزی کے پاس لے جاکر بولے "خلیفہ اسے راتوں رات تیار کردو، منہ مانگی سلائی دوں گا"۔

درزی نے کہا "بابو صاحب آج کل تو ہولی کی بھیڑ ہے۔ ہولی سے پہلے تیار نہ ہوسکیں گے"۔

امرناتھ نے اصرار کے ساتھ کہا "میں منہ مانگی سلائی دوں گا۔ مگر کل دوپہر تک مل جائیں۔ مجھے کل ایک جگہ جانا ہے۔ اگر دوپہر تک نہ ملے تو پھر میرے کسی مصرف کے نہ ہوں گے"۔

درزی نے آدھی سلائی پیشگی لے لی۔ اور کل تیار کر دینے کا وعدہ کیا۔

امرناتھ یہاں سے مطمئن ہوکر مالتی کی طرف چلے۔ قدم آگے بڑھتے تھے لیکن دل پیچھے رہا جاتا تھا۔ کاش وہ ان کی اتنی التجا قبول کرلے کہ کل دو گھنٹہ کے لئے ان کے خانہ ویران کو روشن کرے۔ لیکن یقیناً وہ انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر منہ پھیر لے گی۔ سیدھے منہ بات نہیں کرے گی۔ آنے کا ذکر ہی کیا۔ ایک ہی بے مروت ہے تو کل آکر دیوی جی سے اپنی ساری شرمناک داستان بیان کردوں۔ اس معصوم چہرہ کی بے لوث سرگرمی ان کے دل میں ایک ہیجان پیدا کررہی تھی۔ ان آنکھوں میں متانت تھی۔ کتنا سچا جذبہ درد کتنا خلوص! اس کے سیدھے سادے الفاظ میں کل ایسی تحریک عمل تھی کہ امرناتھ کو اپنی نفس پرورانہ زندگی پر شرم آرہی تھی۔ اب تک کانچ کے ایک ٹکڑے کو ہیرا سمجھ کر سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ آج انہیں معلوم ہوا ہیرا کسے کہتے ہیں۔

اس کے سامنے وہ ٹکڑا حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ مالتی کی وہ جادو بھری چتون! اس کی وہ شیریں ادائیں، اس کی وہ شوخیاں اور سحر طرازیاں سب گویا ملمع اڑ جانے کے بعد اپنی اصلی صورت میں آ رہی تھیں، اور امرناتھ کے دل میں نفرت پیدا کر رہی تھیں۔ وہ مالتی کی طرف جا رہے تھے۔ اس کے دیدار کے لئے نہیں۔ بلکہ اس کے ہاتھوں سے اپنا دل چھین لینے کے لئے۔ محبت کا گدا گر آج اپنے اندر ایک عجیب استغنا کا احساس کر رہا تھا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی۔ کہ اب تک وہ کیوں اتنا بے خبر تھا۔ وہ طلسم جو مالتی نے برسوں کے عشوہ و فریب سے باندھا تھا۔ آج کسی چھو منتر سے تار تار ہو گیا تھا۔ مالتی نے انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو کر کہا "ساڑھی لائے یا نہیں؟"

امرناتھ نے بے نیازی کی شان سے کہا "نہ!"

مالتی نے استعجاب سے ان کی طرف دیکھا۔ نہ! ان کے منہ سے وہ سننے کی عادی نہ تھی۔ یہاں اس نے کامل تسلیم پائی تھی۔ اُس کا اشارہ امرناتھ کے لئے نوشتۂ تقدیر تھا۔ بولی "کیوں؟"

امرناتھ "کیوں کیا، نہیں لائے"

مالتی "بازار میں ملی نہ ہو گی۔ تمہیں کیوں ملنے لگی اور میرے لئے"

امرناتھ "نہیں صاحب ملی۔ مگر لایا نہیں"

مالتی "آخر کوئی وجہ، روپے مجھ سے لے جاتے"

امرناتھ "تم خواہ مخواہ جلاتی ہو، تمہارے لئے میں جان دینے کو حاضر رہا"

مالتی "تو شاید تمہیں روپے جان سے بھی پیارے ہوں گے"

امرناتھ "تم مجھے بیٹھنے دو گی یا نہیں۔ اگر میری صورت سے نفرت ہو تو

چلا جاؤں"
مالتی:- "تمہیں آج ہو کیا گیا ہے - تم تو اتنے تیز مزاج نہ تھے؟"
امرناتھ:- "تم باتیں ہی ایسی کر رہی ہو"
مالتی:- "تو آخر میری چیز کیوں نہیں لائے؟"
امرناتھ نے اس کی طرف دلبرانہ انداز سے دیکھ کر کہا - "دکان پر گیا - ذلت اٹھائی - مگر ساڑھی لے کر چلا تو ایک عورت نے چھین لی - میں نے کہا "میری بیوی کی فرمائش ہے - تو بولی میں انہیں کو دوں گی - کل تمہارے گھر آؤں گی"

مالتی نے شرارت آمیز انداز سے کہا - "تو یہ کہئے - آپ دل ہتھیلی پہ لئے پھر رہے تھے - ایک نازنین کو دیکھا - اور اس کے قدموں پر نثار کر دیا"
امرناتھ:- "وہ ان عورتوں میں نہیں ہے جو دلوں کی گھات میں رہتی ہیں"
مالتی:- "تو کوئی دیوی ہو گی؟"
امرناتھ:- "میں اسے دیوی ہی سمجھتا ہوں"
مالتی - "تو آپ اُس دیوی کی پوجا کیجئے گا"
امرناتھ:- "مجھ جیسے آوارہ نوجوان کے لئے اس مندر کے دروازے بند ہیں"
مالتی:- "بہت حسین ہو گی؟"
امرناتھ:- "نہ حسین ہے، نہ جمیل ہے، نہ خوش ادا ہے، نہ شیریں گفتار ہے - نہ نازک بدن ہے - بالکل ایک معمولی معصوم لڑکی ہے - لیکن جب میرے ہاتھ سے اس نے ساڑھی چھین لی، تو میں کیا کر سکتا تھا - میری غیرت نے تو تقاضا نہ کیا کہ اس کے ہاتھ سے ساڑھی چھین لوں - تمہیں انصاف کرو، وہ دل میں کیا کہتی؟"

مالتی:- "تو تمہیں اس کی زیادہ پروا ہے کہ وہ اپنے دل میں کہے گی - میں کیا کہوں گی اس کی مطلق پروا نہ تھی - میرے ہاتھ سے کوئی مرد میری کوئی چیز چھین لے - تو دیکھوں، چاہے وہ یوسف ثانی ہی کیوں نہ ہو"

امرناتھ:- "اب اسے چاہے میری بزدلی کہو، چاہے کم ہمتی، چاہے شرافت، میں اس کے ہاتھ سے نہ چھین سکتا"

مالتی:- "تو کل وہ ساڑھی لے کر آئے گی، کیوں؟"

امرناتھ:- "ضرور آئے گی"

مالتی:- "تو جا کر منہ دھو آؤ - تم اتنے سادہ لوح ہو - مجھے معلوم نہ تھا - ساڑھی دے کر چلے آئے - اب کل وہ آپ کو دینے آئے گی - کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو"

امرناتھ:- "خیر اس کا کل امتحان ہی ہو جائے گا - ابھی سے کیوں بدگمانی کرتی ہو - تم شام کو ذرا دیر کے لئے میرے گھر تک چلی چلنا"

مالتی:- "جس سے آپ کہیں کہ یہ میری بیوی ہے"

امرناتھ:- "مجھے کیا خبر تھی کہ وہ میرے گھر آنے کے لئے تیار ہو جائے گی - نہیں تو کوئی اور بہانہ کر دیتا"

مالتی:- "تو آپ کی ساڑھی آپ کو مبارک ہو - میں نہیں جاتی"

امرناتھ:- "میں تو روز تمہارے گھر آتا ہوں - تم ایک دن کے لئے بھی نہیں چل سکتی"

مالتی نے سنگدلی سے کہا "اگر موقعہ آ جائے تو تم اپنے کو میرا شوہر کہلانا پسند کرو گے؟ دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا"

امرناتھ دل میں کٹ گئے - بات بناتے ہوئے بولے "مالتی! تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو - برا نہ ماننا - ہمارے اور تمہارے درمیان باوجود

پیار اور محبت کے اظہار کے ایک مغائرت کا پردہ حائل تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی حالت کو سمجھتے تھے۔ اور اس پردہ کو ہٹانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ اور پردہ ہمارے تعلقات کی لازمی شرط تھا۔ ہمارے درمیان ایک ناجائز سمجھوتا سا ہو گیا۔ ہم دونوں اس کی گہرائی میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ نہیں۔ بلکہ میں ڈرتا تھا۔ اور تم ارادتاً نہ جانا چاہتی تھی۔ اگر مجھے یقین ہو جاتا۔ کہ تمہیں رفیق حیات بنا کر میں وہ سب کچھ پا جاؤں گا۔ جس کا میں اپنے کو مستحق سمجھتا ہوں۔ تو میں اب تک کبھی کا تم سے اس کی التجا کر چکا ہوتا۔ لیکن تم نے کبھی میرے دل میں یہ اعتبار پیدا کرنے کی پروا نہ کی۔ میری نسبت بھی تمہیں یہ شک ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا تمہیں یہ شک کرنے کا میں نے کوئی موقعہ نہیں دیا۔ اور میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں اس سے کہیں بہتر شوہر بن سکتا ہوں۔ جتنی تم بیوی بن سکتی ہو۔ میرے لئے صرف اعتبار کی ضرورت ہے۔ تمہارے لئے زیادہ وزنی زیادہ مادی چیزوں کی۔ میری مستقل آمدنی پانچسو سے زیادہ نہیں۔ تم اس پر قناعت نہ کرو گی۔ میرے لئے صرف اس اطمینان کی ضرورت ہے کہ تم میری اور صرف میری ہو۔ بولو منظور ہے؟"

مالتی کو امرناتھ پر رحم آ گیا۔ اس کی باتوں میں جو صداقت بھری ہوئی تھی اس سے وہ انکار نہ کر سکی۔ اسے یہ بھی یقین ہو گیا۔ کہ امرناتھ کسی وفا میں لغزش نہ ہو گی۔ اُسے اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا۔ کہ وہ اُسے رسی سے مضبوط جکڑ سکتی ہے۔ لیکن خود جکڑے جانے پر وہ اپنے کو آمادہ نہ کر سکی۔ اس کی زندگی محبت کی بازی گری میں الفت کی نمائش میں گذری تھی۔ وہ کبھی اِس کبھی اُس شاخ پر چہکتی پھرتی تھی، بے قید آزاد بے بند۔ کیا وہ طائر کنج قفس میں خوش رہ سکتا ہے؟ جس کی زبان انواع و اقسام کے مزوں کی عادی ہو گئی ہو۔

کیا وہ نانِ خشک پر آسودہ ہو سکتا ہے؟ اس احساس نے اسے نرم کر دیا۔
بولی "آج تم بڑی علمیت بگھار رہے ہو؟"
امرناتھ۔ "میں نے تو صرف واقعات بیان کئے ہیں۔"
مالتی۔ "اچھا میں کل چلوں گی۔ مگر ایک گھنٹہ سے زیادہ وہاں نہ رہوں گی۔"
امرناتھ کا دل شکریہ سے لبریز ہو گیا۔" بولا "میں تمہارا بے حد مشکور رہوں۔ مالتی! اب میری آبرو بچ جائے گی۔ نہیں تو میرے لئے گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنا پارٹ کتنی خوب صورتی سے ادا کرتی ہو؟"
مالتی۔ اس کی طرف سے تم اطمینان رکھو۔ بیاہ نہیں کیا مگر براتیں دیکھی ہیں۔ مگر میں ڈرتی ہوں، کہیں تم مجھ سے دغا نہ کر رہے ہو، مردوں کا کیا اعتبار۔"
امرناتھ نے خلوص دل سے کہا۔ "نہیں مالتی! تمہارا شبہ بے بنیاد ہے، اگر یہ زنجیر پیروں میں ڈالنے کا آرزومند ہوتا تو کبھی کا ڈال چکا ہوتا۔ پھر مجھ سے نفس کے بندوں کا وہاں گزر ہی کہاں۔"

(۳)

دوسرے دن امرناتھ دس بجے ہی درزی کی دکان پر جا پہنچے۔ اور سر پر سوار ہو کر کپڑے تیار کرائے۔ پھر گھر آ کر نئے کپڑے پہنے۔ اور مالتی کو بلانے چلے۔ وہاں دیر ہو گئی۔ اس نے ایسا بناؤ سنگار کیا۔ گویا آج بہت بڑا معرکہ سر کرنا ہے۔
امرناتھ نے کہا۔ "وہ حسین نہیں ہے جو تم اتنی تیاریاں کر رہی ہو۔"
مالتی نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

امرناتھ: "لیکن دیر جو ہو رہی ہے؟"

مالتی: "کوئی مضائقہ نہیں"

خطرہ کے اس فطری احتمال نے جو عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ مالتی کو زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ اب تک اس نے کبھی امرناتھ کی جانب خصوصیت کے ساتھ التفات نہ کیا تھا۔ اس سے بے پروائی سے سلوک کرتی تھی۔ لیکن کل امرناتھ کے بشرہ سے اُسے ایک خطرہ کی اطلاع مل چکی تھی، اور وہ اس خطرہ کا اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔ دشمن کو حقیر اور بے چارا سمجھنا صنفِ نازک کے لئے مشکل ہے۔ آج امرناتھ کو اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر وہ اپنی گرفت کو مضبوط کر رہی تھی۔ اگر اسی طرح اس کی چیزیں ایک ایک کر کے نکل گئیں۔ تو پھر وہ اپنا وقار کب تک قائم رکھ سکے گی۔ جس چیز پر اس کا قبضہ ہے اس کی طرف کوئی آنکھ ہی کیوں اٹھائے۔ راجہ بھی تو ایک ایک اُنگلی زمین کے پیچھے جان دیتا ہے۔ وہ اس نئے شکاری کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اس کے جادو کو توڑ دینا چاہتی تھی۔

شام کو وہ غیرت حور بن کر اپنی خادمہ اور نوکر کو ساتھ لے کر امرناتھ کے گھر چلی۔ امرناتھ نے صبح دس بجے تک مردانے گھر کو زنانے پن کا رنگ دینے میں صرف کیا تھا۔ ایسی طیاریاں کر رکھی تھیں۔ گویا کوئی افسر معائنہ کرنے والا ہے۔ مالتی نے گھر میں قدم رکھا تو اس کی صفائی اور سجاوٹ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ زنانے حصہ میں کئی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بولی: "اب لاؤ اپنی دیوی جی کو۔ مگر جلد آنا۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

امرناتھ لپکے ہوئے ولایتی دکان پر گئے۔ آج بھی دھرنا تھا۔ تماشائیوں کا وہی ہجوم۔ وہاں دیوی جی نہ تھیں۔ لیشنٹ کی جانب گئے۔ تو دیوی جی

ایک لڑکی کے ساتھ اُسی بھیس میں کھڑی تھیں۔

امرناتھ نے کہا "معاف کیجئے گا۔ مجھے دیر ہو گئی ہے۔ میں آپ کے وعدہ کی یاد دلانے آیا ہوں"۔

دیوی جی نے کہا "میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ چلو سمترا ذرا آپ کے گھر ہو آئیں۔ کتنی دور ہے؟"

امرناتھ "بہت قریب ہے۔ ایک تانگہ کر لوں گا"۔

پندرہ منٹ میں امرناتھ دونوں کو لئے ہوئے گھر جا پہنچے۔ مالتی نے دیوی جی کو دیکھا، دیوی نے مالتی کو۔ ایک کسی رئیس کا محل تھا عالیشان۔ دوسرا کسی فقیر کی کٹی تھی مختصر اور حقیر۔ رئیس کے محل میں تکلف اور نمائش تھی، فقیر کی کٹی میں سادگی اور صفائی۔ مالتی نے دیکھا۔ معصوم دوشیزہ ہے۔ جسے کسی صورت حسین نہیں کہہ سکتے۔ پر اس کی معصومیت اور سادگی میں جو کشش تھی۔ اس سے وہ غیر متاثر نہ رہ سکی۔ دیوی جی نے بھی دیکھا۔ ایک تکلف پسند بیباک، مغرور عورت ہے، جو کسی نہ کسی وجہ سے اس گھر میں بیگانہ سی معلوم ہو رہی ہے، جیسے کوئی جنگلی جانور پنجرے میں آ گیا ہو۔

امرناتھ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑے تھے، اور ایشور سے دعا کر رہے تھے کہ کسی طرح آج پردہ رہ جائے۔

دیوی نے آتے ہی کہا "بہن! آپ اب بھی سر سے پاؤں تک بدیشی کپڑے پہنے ہوتی ہیں؟"

مالتی نے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا "میں بدیسی اور دیسی کے پھیر میں نہیں پڑتی۔ جو یہ لا کر دیتے ہیں۔ وہ پہنتی ہوں۔ لانے والے ہیں یہ۔ میں تھوڑی ہی بازار جاتی ہوں"۔

دیوی نے امرناتھ کی طرف گلہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "آپ تو کہتے تھے یہ ان کی فرمائش ہے۔ یہ آپ ہی کا قصور نکل آیا۔"

مالتی۔ "تو میرے سامنے ان سے کچھ نہ کہو۔ تم بازار میں بھی دوسرے مردوں سے باتیں کر سکتی ہو۔ جب وہ باہر چلے جائیں، تو جتنا جی چاہے کہہ سننا، میں اپنے کانوں سے نہیں سننا چاہتی۔"

دیوی جی۔ "میں کچھ کہتی نہیں ہوں۔ بہن جی کہہ ہی کیا سکتی ہوں، کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔ صرف عرض کر سکتی ہوں۔"

مالتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اپنے ملک کی بھلائی کا ذرا بھی خیال نہیں اس کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ دس آدمی عزت کرتے ہیں۔ اپنا نفع اور نقصان سمجھ سکتے ہیں۔ تمہیں مجاز نہیں ہے کہ انہیں ایڈیش دینے بیٹھو یا سب سے زیادہ عقلمند تمہیں ہو؟"

دیوی۔ "آپ میرا منشا غلط سمجھ رہی ہیں بہن۔"

مالتی۔ "ہاں غلط تو سمجھوں گی ہی۔ اتنی تمیز کہاں سے لاؤں کہ آپ کی باتوں کا مطلب سمجھوں۔ کھدر کی ساڑھی پہن لی۔ جھولی لٹکا لی۔ ایک بلا لگا لیا بس آپ کا اختیار ہے۔ جہاں چاہیں آئیں جائیں۔ جس سے چاہیں ہنسیں بولیں گھر میں کوئی پوچھنا نہیں، تو جیل خانے کا بھی کیا ڈر، میں اسے ہڑونگا پن سمجھتی ہوں۔ جو شریفوں کی بہو بیٹیوں کے لئے جائز نہیں۔"

امرناتھ دل میں کٹے جا رہے تھے، چھپنے کے لئے بل ڈھونڈ رہے تھے۔

دیوی کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ تھا۔ لیکن آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

امرناتھ نے مالتی سے ذرا تیز لہجہ میں کہا۔ "کیوں خواہ مخواہ کسی کا دل دکھاتی ہو۔ یہ دیویاں اپنا عیش و آرام چھوڑ کر یہ کام کر رہی ہیں۔ کیا تمہیں اس

کی بالکل خبر نہیں"

مالتی "پڑ رہنے دو۔ بہت تعریف نہ کرو۔ زمانہ کا رنگ ہی بدلا جا رہا ہے میں کیا کروں گی اور تم کیا کرو گے۔ تم مردوں نے عورتوں کو گھر میں اتنی بُری طرح قید کیا کہ آج وہ رسم و رواج شرم و حیا کو چھوڑ نکل آئی ہیں، اور کچھ دنوں میں تم لوگوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ ولایتی اور بدیشی تو دکھانے کے لئے ہے اصل میں یہ آزادی کی خواہش ہے جو تمہیں حاصل ہے۔ تم اگر دو چار شادیاں کر سکتے ہو تو عورت کیوں نہ کرے۔ تم اگر بازار کی سیر کر سکتے ہو۔ تو عورت کیوں نہ کرے۔ یہ ہے حقیقت، اگر آنکھیں ہیں تو اب کھول کر دیکھو۔ کیسی وہ آزادی نہ چاہیئے۔ یہاں تو لاج دھوتے ہیں، اور میں شرم و حیا کو اپنا سنگار سمجھتی ہوں"

دیوی جی نے امرناتھ کی طرف فریاد کی آنکھوں کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "بہن نے عورتوں کو ذلیل کرنے کی قسم سی کھالی ہے۔ میں بڑی بڑی امیدیں لے کر آئی تھی۔ مگر شاید یہاں سے ناکام جانا پڑے گا"

امرناتھ نے وہ ساڑھی اُسے دیتے ہوئے کہا "نہیں بالکل ناکام تو آپ نہ جائیں گی۔ ہاں متوقع کامیابی نہ ہو گی"

مالتی نے تحکمانہ انداز سے کہا "وہ میری ساڑھی ہے۔ اسے تم نہیں دے سکتے"

امرناتھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا "اچھی بات ہے، نہ دوں گا۔ دیوی جی ایسی حالت میں تو شائد آپ مجھے معاف کریں گی"

دیوی جی چلی گئیں۔ تو امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا "یہ تم نے آج میرے منہ میں سیاہی لگا دی۔ تم اتنی بدتمیز اور بدزبان ہو۔ مجھے معلوم نہ تھا"

مالتی نے تند لہجہ میں کہا "تو اپنی ساڑھی اُسے دے دیتے۔ ایسی کچی گولیاں

نہیں کھیلی ہوں۔ اب تو بدتمیز بھی ہوں، بدزبان بھی ہوں۔ اُس دن اِن برائیوں میں سے ایک بھی نہ تھی۔ جب میری جُوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ اس چھوکری نے موہنی ڈال دی۔ جیسی روح ویسے فرشتے مبارک ہو۔"

یہ کہتی ہوئی مالتی باہر نکلی۔ اُس نے سمجھا تھا۔ چرب زبانی اور حُسن کی طاقت سے وہ اس دوشیزہ کو اکھاڑ پھینکے گی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ امرناتھ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔ تو اس نے اُسے پھٹکار بتائی۔ ان داموں اگر امرناتھ مل سکتا تو بُرا نہ تھا۔ اس سے زیادہ قیمت وہ ان کے لئے دے نہ سکتی تھی۔"

امرناتھ اس کے ساتھ دروازے تک آئے۔ جب وہ تانگہ پر بیٹھی۔ تو منت کرکے بولا۔" یہ ساڑھی دے دو نا مالتی! میں تمہیں کل اس سے بدرجہا بہتر ساڑھی لا دُوں گا۔"

مالتی نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا۔" یہ ساڑھی تو اب لاکھ روپئے پر بھی نہیں دے سکتی۔"

امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا۔" اچھی بات ہے، لے جاؤ۔ مگر یہ سمجھ لو۔ یہ میرا آخری تحفہ ہے۔"

مالتی نے ہونٹ چبا کر کہا۔" اس کی پروا نہیں۔ تمہارے بغیر میں مر نہ جاؤں گی۔ اس کا تمہیں یقین دلاتی ہوں۔"

جیل

آنند نے گدے دار کرسی پر بیٹھ کر سگار جلاتے ہوئے کہا "آج وشومبھر نے کیسی حماقت کی۔ امتحان قریب ہے، اور آپ آج والنٹیر بن بیٹھے، کہیں پکڑے گئے تو امتحان سے ہاتھ دھوئینگے۔ میرا تو خیال ہے، وظیفہ بھی بند ہو جائے گا"

سامنے دوسرے کوچ پر روپ منی بیٹھی ایک اخبار دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اخبار کی طرف تھیں۔ مگر کان آنند کی طرف لگے ہوئے تھے۔ بولی۔

"یہ تو بہت بُرا ہُوا۔ تم نے سمجھایا نہیں؟"

آنند نے منہ بنا کر کہا "جب کوئی اپنے کو دوسرا گاندھی سمجھ لے تو اُسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اُلٹا مجھے سمجھانے لگتا ہے"

روپ منی نے اخبار کو لپیٹ کر زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا "تم نے مجھے بھی تو نہیں بتایا۔ شاید میں اُسے روک سکتی"

آنند نے کچھ چڑھ کر کہا "تو ابھی کیا ہُوا ہے۔ ابھی تو شاید کانگریس آفس ہی میں ہوگا۔ جا کر روک لو"

آنند اور وشومبھر دونوں ہی یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ آنند کے حصہ میں لکشمی بھی پڑی تھی سرسوتی بھی۔ وشومبھر کو تقدیر نے کرایا دفعا۔ پروفیسروں نے مہربانی کر کے ایک چھوٹا سا وظیفہ دے دیا تھا۔ بس یہی اس کے گزارے

کی سبیل تھی۔ روپ متی بھی ایک سال قبل انہیں کی جماعت میں پڑھتی تھی۔ مگر اس سال اس کی صحت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ اس لئے اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ دونوں نوجوان کبھی کبھی اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ آنند آتا تھا اس کا دل لینے کے لئے۔ وشومبھر آتا تھا یونہی دل بہلانے کے لئے طبیعت پڑھنے میں نہ لگتی یا جی گھبراتا تو وہ یہاں آبیٹھتا تھا۔ شاید اس سے اپنی مصیبت کی داستان کہہ کر اس کا دل سکون پا جاتا تھا۔ آنند کے سامنے کچھ اظہار درد کی اس میں ہمت نہ تھی۔ آنند کے پاس اس کے لئے ہمدردی کا ایک کلمہ شیریں بھی نہ تھا، وہ اسے پھٹکارتا تھا۔ ذلیل کرتا تھا اور بناتا تھا۔ وشومبھر میں اس سے بحث کرنے کی قابلیت نہ تھی۔ آفتاب کے روبرو چراغ کی ہستی ہی کیا۔ آنند اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اس دماغی غلبہ کو پرے پھینکا۔ اور اسی کی شکایت لے کر روپ متی کے پاس آیا تھا۔ جنہوں وشومبھر نے اپنے اندرونی خیالات کو آنند کے خیالات میں جذب کرنے کی سعی کی۔ لیکن دلائل کی دنیا میں شکست کھا کر بھی اس کا دل بغاوت کرتا رہا۔ بلاشبہ اس کا ایک سال ضائع ہو جائے گا۔ ممکن ہے۔ اس کی کالج کی زندگی کا سدا کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ پھر ان چودہ پندرہ سالوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔ نہ خدا ہی ملے گا۔ نہ وصال صنم نصیب ہوگا۔ آگ میں کودنے سے کیا حاصل؟ یونیورسٹی میں رہ کر بھی تو بہت کچھ ملک کا کام کیا جا سکتا ہے۔ آنند مہینے میں کچھ نہ کچھ چندہ جمع کر دیتا تھا، کچھ طلبا سے سودیشی کا عہد کرا لیتا تھا۔ وشومبھر کو بھی آنند نے یہی مشورہ دیا، اس کی دلیلوں نے وشومبھر کی عقل کو جیت لیا۔ لیکن اس کے دل کو جیت نہ سکا۔ آج جب آنند کالج گیا

تو وشومبھر کا خط ملا

"پیارے آنند! مجھے بخوبی علم ہے کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں، وہ میرے لئے فائدہ بخش نہیں ہے۔ لیکن نہ جانے کون سی قوت مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے۔ میں جانا نہیں چاہتا۔ لیکن جاتا ہوں۔ جب وہ سبھی لوگ جن کی ہمارے دلوں میں عزت ہے۔ اوکھلی میں سر ڈال چکے۔ تو میرے لئے بھی اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ میں اب اور اپنے دل کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یونیورسٹی کی ڈگری اچھی شے ہے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے اور عزت کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔"

تمہارا وشومبھر

خط پڑھ کر آنند کے جی میں آیا کہ وشومبھر کو سمجھا بجھا کر لوٹا لائے۔ مگر اس کی حماقت پر غصہ آیا۔ اور اسی طیش میں روپ منی کے پاس جا پہنچا۔ اگر روپ منی اس کی خوشامد کر کے کہتی "جا کر اسے لوٹا لاؤ"، تو شاید وہ چلا جاتا۔ پر اس کا یہ کہنا کہ میں اسے روک لیتی۔ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس کے جواب میں ناراضی تھی۔ سرد مہری تھی۔ اور شاید کسی قدر حسد بھی تھا۔

روپ منی نے ادائے غرور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "اچھی بات ہے، میں جاتی ہوں" پھر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "تم کیوں نہیں چلتے؟"

پھر وہی غلطی۔ اگر روپ منی اس کی خوشامد کر کے کہتی۔ تو آنند ضرور اس کے ساتھ چلا جاتا۔ لیکن اس کے سوال میں پہلے ہی یہ اندیشہ چھپا تھا کہ آنند جانا نہیں چاہتا۔ مغرور آنند اس طرح نہیں جا سکتا۔ اس نے

اُداس ہوکر جواب دیا "میرا جانا لا حاصل ہے۔ تمہاری باتوں کا زیادہ اثر ہوگا۔ وہ میری میز پر یہ خط چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ روح اور فرض اور معراج کی بڑی بڑی باتیں سوچ رہا ہے، اور اپنے آپ کو بھی آسمان کا باشندہ تصور کرتا ہے تو میرا اُس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔" اُس نے جیب سے خط نکال کر روپ منی کے سامنے رکھ دیا۔ ان الفاظ میں جو اشارہ اور طعن تھا۔ اُس نے ایک لمحہ تک روپ منی کو اس کی طرف دیکھنے نہ دیا آنند کے اس ظالمانہ حملہ نے اُسے جیسے ہلاک کر دیا۔ پھر ایک ہی لمحہ میں سرکشی کی ایک چنگاری سی اس کے اندر جا گھسی۔ اُس نے نہایت سکون سے خط کھول کر پڑھا۔ پڑھا صرف آنند کے حملہ کا جواب دینے کے لئے۔ لیکن پڑھتے پڑھتے اُس کا چہرہ جیسے چمکنے لگ گیا۔ گردن تن گئی۔ آنکھوں میں ایثار کی سرخی آگئی۔

اُس نے خط کو میز پر رکھ دیا۔ اور بولی "نہیں اب میرا جانا بھی بیکار ہے۔" آنند نے اپنی جیت پر خوش ہوکر کہا "میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس وقت اُس کے سر پر بھوت سا سوار ہے۔ اُس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہ ہوگا۔ جب سال بھر جیل میں چکّی پیس لے گا۔ اور وہاں سے تپ دق لے کر نکلے گا۔ یا پولیس کے ڈنڈے سے سر اور ہاتھ پاؤں تڑوا لے گا۔ تو عقل ٹھکانے آئے گی۔ ابھی تو جیے اور تالیوں کے خواب دیکھ رہا ہوگا۔"

روپ منی سامنے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسے نیلے آسمان میں بادل کی ایک تصویر سی نظر آئی۔ کمزور۔ دُبلی پتلی۔ برہنہ جسم، گھٹنوں تک دھوتی۔ جھکا سر، پوپلا منہ، عبادت، ایثار اور صداقت کی زندہ مورت۔

آنند نے پھر کہا۔" اگر مجھے یقین ہو کہ میرے خون سے ملک بیدار ہو جائیگا تو میں اپنا خون دینے کو آج تیار ہوں۔ لیکن میرے جیسے سو پچاس آدمی نکل آئے تو کیا ہوگا۔ جان دے دینے کے علاوہ اور تو کچھ نتیجہ نظر نہیں آتا۔"

روپ منی اب بھی وہی بادل کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ اس کا وہ تبسم، وہ سادہ دل فریب مسکراہٹ جس نے کائنات کو جیت لیا ہے۔ آنند پھر بولا۔" جن حضرات کو امتحان کا بھوت ستایا کرتا ہے۔ انہیں خدمت وطن کی سوجھتی ہے۔ کوئی پوچھے آپ اپنی خدمت تو کر نہیں سکتے۔ وطن کی کیا خدمت کریں گے۔ ادھر کے ڈنڈے بھی ہیں۔"

روپ منی کی آنکھیں اب بھی آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ آنند نے جیسے چونک کر کہا۔" ہاں بڑا پر لطف فلم ہے۔ چلتی ہو پہلے شو میں دیکھ آئیں۔"

روپ منی نے گویا آسمان سے نیچے اتر کر جواب دیا۔" نہیں میرا جی نہیں چاہتا۔" آنند نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔" کیوں طبیعت تو اچھی ہے۔"

روپ منی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ بولی۔" ہاں طبیعت کو کیا ہوا ہے۔"

آنند۔" تو چلتی کیوں نہیں؟"

روپ منی۔" آج جی نہیں چاہتا۔"

آنند۔" تو پھر میں بھی نہ جاؤں گا۔"

روپ منی۔" نہایت نیک خیال ہے۔ ٹکٹ کے دام کسی کارِ خیر میں دے دو۔"

آنند۔" یہ تو ٹیڑھی شرط ہے۔ مگر منظور۔"

روپ منی۔" کل رسید مجھے دکھا دینا۔"

آنند: "تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں"
وہ کچھ بیدل ہو کر ہوسٹل چلا گیا۔ ذرا دیر بعد روپ متی سوراج بھون کی طرف چلی۔

(۲)

روپ متی سوراج بھون پہنچی تو والنٹیروں کی ایک جماعت بدیشی کپڑوں کے گوداموں پر دھرنا دینے جا رہی تھی۔ وشومبھر اس جماعت میں نہ تھا۔ دوسری جماعت شراب کی دوکانوں پر جانے کو تیار تھی۔ وشومبھر اس میں بھی نہ تھا۔ روپ متی نے سیکرٹری کے پاس جا کر کہا "آپ بتا سکتے ہیں۔ وشومبھر کہاں ہیں؟"
سیکرٹری: "کون وشومبھر؟ وہی جو آج ہی بھرتی ہوئے ہیں؟"
روپ متی: "جی ہاں وہی"
سیکرٹری: "بڑا دلیر آدمی ہے۔ اُس نے دیہات میں کام کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ سٹیشن پر پہنچ چکا ہوگا۔ سات بجے کی گاڑی سے جا رہا ہے"
روپ متی: "تو ابھی سٹیشن پر ہوں گے؟"
سیکرٹری نے گھڑی پر نظر ڈال کر جواب دیا "ہاں ابھی شاید سٹیشن پر مل جائیں"
روپ متی نے باہر نکل کر سائیکل تیز کی۔ سٹیشن پر پہنچی تو دیکھا وشومبھر پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ روپ متی کو دیکھتے ہی اس کے پاس چلا آیا۔ اور بولا۔ "تم یہاں کیسے آ گئیں۔ آج آنند سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟"
روپ متی نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا "یہ تم نے کیا صورت بنا لی ہے۔ کیا پاؤں میں جوتا پہننا بھی حُبِّ وطن کے خلاف ہے؟"

وشومبھر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "آنند بابو جی نے تم سے کچھ کہا نہیں؟"

روپ متی نے جواب دیا "ہو جی ہاں کہا ہے۔ تمہیں یہ کیا سوجھی ہے۔ دو سال سے کم کے لئے نہ جاؤ گے۔ اتنا سوچ لو۔"

وشومبھر کا منہ اُتر گیا۔ بولا "جب یہ جانتی ہو تو کیا تمہارے پاس میری ہمت بڑھانے کو دو لفظ بھی نہیں ہیں؟"

روپ متی کا دل مسوس اُٹھا۔ مگر اُس نے ظاہر نہ کیا۔ بولی "تم مجھے دشمن سمجھتے ہو یا دوست؟"

وشومبھر نے آنکھوں میں آنسو بھر کہا "تم ایسا سوال کیوں پوچھتی ہو؟ روپ متی! اس کا جواب میرے منہ سے سُننے بغیر بھی تم کہہ سکتی ہو کہ میرا جواب کیا ہوگا؟"

روپ متی "تو میرا مشورہ یہ ہے کہ مت جاؤ۔ اب بھی لوٹ چلو۔"

وشومبھر "یہ دوست کا مشورہ نہیں ہے۔ روپ متی! مجھے یقین ہے۔ یہ بات تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ ذرا سوچو میری جان کی قیمت کیا ہے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپے کی ملازمت۔ بہت بڑھا تو تین چار سو تک پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بدلے یہاں کیا ملے گا۔ جانتی ہو سارے ملک کے لئے سوراج اتنے عظیم الشان مقصد کے لئے مر جانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔ اب جاؤ گاڑی آ رہی ہے۔ آنند بابو سے کہنا مجھ سے ناراض نہ ہوں۔"

روپ متی نے آج تک اس کند ذہن نوجوان پر رحم کیا تھا۔ اس وقت اسے اس سے عقیدت ہو چلی۔ ایثار میں دل کو کھینچنے کی جو قوت ہے۔ روپ متی کو اس نے زور سے کھینچا۔ پھر نا موافق حالات کا تفاوت مٹ

سما گیا۔ وشومبھر میں جس قدر خامیاں تھیں۔ وہ سب خوبیاں بن کر چمک اٹھیں اس کے دل کی وسعتوں میں وہ کسی پنچھی کے مانند اڑ اڑ کر گوشۂ عافیت تلاش کرنے لگیں۔

روپ متی نے اُس کی طرف عقیدتمندانہ انداز سے کہا "مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو"۔

وشومبھر کو جیسے گھڑوں نشہ چڑھ گیا۔ بولا "تم کو آنند بابو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے"۔

روپ متی "میں آنند بابو کے ہاتھوں بکی نہیں ہوں"۔

وشومبھر "آنند تو تمہارے ہاتھوں بکے ہوتے ہیں"۔

روپ متی نے سرکش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ بولی نہیں ماحول اُسے اس وقت پاؤں کی بیڑیاں معلوم ہو رہا تھا۔ کاش وہ بھی وشومبھر کے مانند آزاد ہوتی۔ امیر والدین کی اکلوتی لڑکی ناز و نعمت میں پلی ہوئی۔ اس وقت اپنے آپ کو مقید سمجھ رہی تھی۔ اس کی روح ان بندشوں کو توڑنے کے لئے پھڑ پھڑانے لگی۔

گاڑی آ گئی۔ مسافر اُترنے لگے۔ روپ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "تم مجھے نہیں لے چلو گے؟"

وشومبھر نے مستقل مزاجی سے جواب دیا "نہیں"۔

روپ متی "کیوں؟"

وشومبھر "میں اس کا جواب دینا نہیں چاہتا"۔

روپ متی "کیا تم سمجھتے ہو۔ میں دیہات میں نہ رہ سکوں گی"۔

وشومبھر نادم ہو گیا۔ یہ بھی ایک بڑا سبب تھا۔ مگر اُس نے انکار

کر دیا" نہیں یہ بات تو نہیں ہے روپ متی!"

روپ متی" تو پھر کیا بات ہے۔ کیا اندیشہ ہے کہ والد صاحب مجھے گھر سے نکال دیں گے؟"

وشو مبھر" اگر یہ اندیشہ ہو کیا یہ کم ہے؟"

روپ متی" میں اس کی ذرا پروا نہیں کرتی۔ ایک تنکے برابر بھی نہیں"

وشو مبھر نے دیکھا روپ متی کے چاند سے چہرے پر آہنی ارادہ کی روشنی چمک رہی ہے۔ وہ اس ارادے کے سامنے کانپ اٹھا۔ بولا۔

"میری یہ درخواست قبول کرلو۔ روپ متی! میں تم سے یہ منت کرتا ہوں"۔

روپ متی سوچنے لگی۔

وشو مبھر نے کہا" میری خاطر تمہیں یہ ارادہ ترک کردینا ہوگا"

روپ متی سر جھکا کر بولی" اگر یہ تمہارا حکم ہے۔ تو میں اس کی تعمیل کروں گی۔ وشو مبھر! تم شاید دل میں سمجھتے ہوگے۔ یہ عارضی جوش میں آکر اس وقت مستقبل کو غارت کرنے جارہی ہے۔ میں ثابت کردوں گی، یہ میرا عارضی جوش نہیں بلکہ مصیبتوں میں بھی قائم رہنے والا عزم ہے۔ جاؤ مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ قانون نے پنجہ میں اسی وقت آنا جب تمہاری اصول پرستی پر حرف آتا ہو۔ میں تمہاری کامیابی کے لئے پرارتھنا کرتی رہونگی"۔

گاڑی نے سیٹی دی۔ وشو مبھر اندر جا بیٹھا۔ گاڑی چلی گئی۔ روپ متی گویا کائنات کی دولت آنچل میں لئے کھڑی رہی۔

(۳)

روپ متی کے پاس وشو مبھر کا ایک پرانا بوسیدہ سا فوٹو الماری کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ آج سٹیشن سے لوٹ کر اس نے اسے نکالا۔ اور اسے

ایک خوبصورت فریم میں لگا کر میز پر رکھ دیا۔ آنند کا فوٹو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

وشومبھر نے تعطیلوں میں اُسے دو چار خطوط لکھے تھے۔ روپ منی نے انہیں پڑھ کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ آج اس نے اُن خطوط کو نکالا اور انہیں دوبارہ پڑھا۔ اُن خطوط میں آج حلاوت تھی۔ روپ منی نے انہیں نہایت حفاظت سے رائٹنگ بکس میں بند کر دیا۔

دوسرے دن اخبار آیا تو روپ منی اُس پر ٹوٹ پڑی۔ وشومبھر کا نام دیکھ کر وہ مسرت سے پھول اٹھی۔ دن میں ایک مرتبہ سوراج بھون میں جانا اس کا معمول ہو گیا۔ جلسوں میں برابر شریک ہوتی۔ عیش و آرام کی تمام اشیاء ایک ایک کر کے پھینک دیں۔ ریشمی ساڑھیوں کی جگہ گاڑھے کی ساڑھیاں آئیں۔ چرخہ بھی آیا۔ وہ گھنٹوں بیٹھی سُوت کاتا کرتی۔ اُس کا سُوت روز بروز باریک ہوتا جاتا تھا۔ اسی سوت سے وہ وشومبھر کے کرتے بنائے گی۔

اُس زمانہ میں امتحان کی تیاریاں تھیں۔ آنند کو پھر اُس سے ملنے کی فرصت نہ ملی۔ دو ایک مرتبہ وہ آیا۔ لیکن زیادہ دیر وہ بیٹھا نہیں۔ شاید روپ منی کی سرد مہری نے اسے نہ بیٹھنے دیا ہو۔

ایک مہینہ بیت گیا۔

ایک دن شام کو آنند آیا۔ روپ منی سوراج بھون جانے کو تیار تھی، آنند نے بھویں سکوڑ کر کہا "تم سے تو اب بات کرنا بھی مشکل ہے"

روپ منی نے کرسی پر بیٹھ کر جواب دیا "تمہیں بھی تو کتابوں سے چھٹی نہیں ملتی۔ آج کی کچھ تازہ خبر نہیں ملی۔ سوراج بھون میں روز روز کی خبریں مل جاتی ہیں"

آنند نے فلاسفروں کی سی افسردگی سے کہا "وشومبھر نے تو سُنا ہے

دیہات میں خوب شور و غل مچا رکھا ہے۔ جو کام اس کے لائق تھا۔ اُسے مل گیا۔ یہاں اس کی زبان نہ کھلتی تھی۔ وہاں دیہات میں خوب گرجتا ہوگا۔ آدمی من چلا ہے۔"

روپ متی نے اُس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھی، تم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اور بولی "آدمی میں اگر یہ خوبی ہے تو دوسرے سارے عیب مٹ جاتے ہیں۔ قومی خبریں پڑھنے کو کب فرصت ملتی ہوگی وشومبھر نے گاؤں میں ایسی بیداری پیدا کر دی ہے۔ کہ بدیشی کپڑے کا ایک تار بھی نہیں بکنے پاتا نہ کوئی نشہ کی دکانوں پر جاتا ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ پکیٹنگ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اب قومی پنچائتیں کھول رہے ہیں۔"

آنند نے بے پرواہی سے کہا "تو سمجھ لو۔ اب اس کے چلنے کے دن بھی آگئے۔"

روپ متی نے جوش سے جواب دیا "اتنا کام کرکے جانا بہت سستا نہیں ہے۔ کل تو وہاں ایک بڑا جلسہ ہونے والا تھا۔ پرگنہ بھر کے لوگ جمع ہوئے ہوں گے۔ سنا ہے آج کل دیہات سے کوئی مقدمہ نہیں آتا۔ وکیلوں کی نانی مری جا رہی ہے۔"

آنند نے قدرے جوش سے کہا "یہی تو سوراج کا مزہ ہے کہ زمیندار وکیل اور بیوپاری سب مریں۔ صرف مزدور اور کسان رہ جائیں۔"

روپ متی نے سمجھ لیا۔ آج آنند تُل کر آیا ہے۔ اس نے بھی جیسے آستین چڑھاتے ہوئے کہا "تو کیا چاہتے ہو کہ زمیندار اور وکیل اور بیوپاری غریبوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے چلے جائیں۔ اور کوئی زبان نہ کھولے۔"

آنند گرم ہو کر بولا "علم اور دولت کی حکمرانی ہمیشہ رہی ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ ہاں اس کی صورت بدل سکتی ہے"

روپ منی نے جوش سے کہا۔ "اگر سوراج ملنے پر بھی دولت کو ہی جگہ ملے۔ اور تعلیم یافتہ لوگ سوسائٹی میں اسی طرح غرض کے اندھے بنے رہیں۔ تو سوراج نہ ملنا اچھا۔ اُمراء کے تمول اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خود غرضیوں نے ہمیں پیس ڈالا ہے۔ جن بُرائیوں کو رفع کرنے کے لئے آج ہم جان کو ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں انہی برائیوں کو کیا ہم اس لئے سر پر چڑھائیں گے کہ وہ بدیشی نہیں سودیشی ہیں۔ کم از کم میرے لئے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں کہ جان کی جگہ گوبند آ بیٹھے۔ میں سوسائٹی کی ایسی حالت دیکھنا چاہتی ہوں جہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی پیٹ بھر کر کھانا میسر آ سکے"

آنند۔ "یہ تمہاری ذاتی رائے ہوگی؟"

روپ منی۔ "تم نے ابھی اس تحریک کا لٹریچر پڑھا ہی نہیں ہے"

آنند۔ "نہ پڑھا ہے۔ نہ پڑھنا چاہتا ہوں"

روپ منی۔ "نہ پڑھو۔ اس سے ملک کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے"

آنند۔ "تم تو جیسے وہ رہی ہی نہیں۔ بالکل کایا پلٹ ہو گئی"

اتنے میں چھٹی رسان نے اخبار لا کر میز پر رکھ دیا۔ روپ منی نے بے صبری سے اُسے کھولا۔ پہلے عنوان پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں جیسے سرور چھا گیا۔ گردن خود بخود تن گئی اور چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور برسنے لگا۔

اس نے جوش سے کھڑے ہو کر کہا "وشو مبھر گرفتار ہو کر دو سال کے لئے جیل چلے گئے"

آنند نے افسردگی سے پوچھا "کس معاملہ میں؟"

روپ متی نے وشو مبھر کے فوٹو کی طرف تاکتے ہوئے "رانی گنج میں جلسہ تھا - وہیں پکڑے گئے ہیں"

آنند - "میں نے تو پہلے ہی کہا - دو سال کے لئے جائیں گے - زندگی خراب کر ڈالی"

روپ متی نے سرد مہری سے کہا "کیا ڈگری لے لینے سے ہی آدمی کی زندگی شاندار بنتی ہے - کیا سارا علم، سارا تجربہ کتابوں ہی میں بھرا ہوا ہے - میرا خیال ہے - انسانی فطرت کا جس قدر عملی تجربہ وشو مبھر کو دو سال میں ہو جائے گا - اتنا تجربہ فلسفہ اور منطق کی کتابوں سے تمہیں دس سال میں بھی نہ ہوگا - اگر تعلیم کا مقصد کیرکٹر ہے تو ملکی تحریک میں اس کے جس قدر ذرائع ہیں وہ پیٹ کی لڑائی میں کبھی نہیں ہو سکتے - تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہمارے لئے پیٹ کی فکر ہی بہت ہے - تو میں مان لوں گی - لیکن ملک اور قوم کی خدمت کرنے والوں کو بے وقوف بنانا - میرے لئے ناقابل برداشت ہے"

آنند - "آج وشو مبھر کو مبارک باد دینے کے لئے جلسہ ہوگا - جاؤ گی؟"

روپ متی نے خودسرانہ انداز میں کہا "ضرور جاؤں گی - میں تو لیکچر بھی دوں گی - کل رانی گنج چلی جاؤں گی - وشو مبھر نے جو چراغ روشن کیا ہے - میری زندگی میں بجھنے نہ پائے گا"

آنند نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح تنکے کا سہارا لے کر کہا "تم نے

اپنے والدین سے کبھی پوچھا؟"

روپ منی: "پوچھ لوں گی"

آنند: "اور وہ تمہیں اجازت دے دیں گے؟"

روپ منی: "اصول کے سامنے کسی کی اجازت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی"

آنند: "اچھا - یہ نئی بات معلوم ہوئی"

یہ کہتا ہوا آنند اُٹھ کھڑا ہوا - اور بغیر کچھ کہے کمرہ سے باہر نکل گیا - اُس وقت اُس کے پیر اس طرح لڑکھڑا رہے تھے - جیسے اب گرا اب گرا۔

وفا کی دیوی

ماگھ کا مہینہ۔ صبح کا وقت۔ ہردوار میں گنگا کا کنارہ۔ اشنان کا میلہ، صبح کی زریں شعاعوں میں سامنے کی پہاڑیاں نہائی کھڑی ہیں۔ جاتریوں کا اتنا ہجوم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ جابجا سادھو سنتوں اور بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اسی وقت سانگلی کے کنور صاحب اور ان کی رانی اشنان کرنے آتے ہیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی چھ سال کی لڑکی بھی ہے۔ کنور صاحب کے سر پہ جے پوری پگڑی، نیچی اچکن، امرتسری جوتے، بڑی بڑی مونچھیں۔ تناور جسم، رانی گندمی رنگ، نازک بدن، زیوروں سے لدی ہوئی، لڑکی بھی زیور پہنے ہوئے ہے۔ اُن کے ساتھ کئی سپاہی، پیادے، بھالے بلّم لئے وردیاں پہنے چلے آ رہے ہیں۔ کئی خدمت گار بھی ہیں۔

یہ لوگ ہجوم کو ہٹاتے دریا کے کنارے پہنچ کر اشنان کرتے ہیں۔ رانی کے اشنان کے لئے چار آدمی پردہ کرتے ہیں۔ لڑکی پانی سے کھیل رہی ہے۔ راجہ صاحب پنڈتوں کو دان دے رہے ہیں۔ اور لڑکی اپنی کشتی پانی میں تیرا رہی ہے۔ یکایک کشتی ایک ریلے میں بہہ جاتی ہے۔ لڑکی اسے پکڑنے کے لئے لپکتی ہے۔ اسی وقت آدمیوں کا ایسا ریلا آتا ہے کہ لڑکی ماں باپ سے الگ ہو جاتی ہے۔ کبھی ادھر بھاگتا۔ کبھی اُدھر۔ بار بار اپنی ماں کو دیکھنے کا

دھوکا ہوتا ہے۔ پھر وہ رونے لگتی ہے۔ مارے خوف کے کسی سے کچھ بولتی نہیں نہ راستہ پوچھتی ہے۔ کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ اور رہ رہ کر اپنی ماں کو پکارتی ہے۔ یکایک ایک راستہ دیکھ کر اسے قیامگاہ کے راستے کا گمان ہوتا ہے۔ اسی پر ہو لیتی ہے۔ مگر وہ راستہ اس کو دھرم شالہ سے دور لئے جا رہا ہے۔

ادھر کنور صاحب اور اُن کی رانی لڑکی کو نہ پاکر ادھر اُدھر تلاش کرنے لگتے ہیں۔ بدحواس ہو کر اپنے ملازموں پر بگڑتے ہیں۔ ملازم لڑکی کی تلاش میں چلے جاتے ہیں۔ رانی ایک چھوٹی لڑکی کو دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف دوڑتی ہے۔ مگر جب اپنی غلطی ظاہر ہوتی ہے۔ تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگتی ہے۔ کنور صاحب غصہ سے آگ ہو رہے ہیں۔ مگر کہیں تلاش کرنے نہیں جاتے۔ ابھی اُن کا صافا ٹھیک نہیں ہوا۔ اچکن بھی سجل نہیں ہوئی۔ بال بھی نہیں سنوارے جا سکے۔ نوکر نواب وہاں رہے نہیں۔ تب وہ ہنٹر توں پر بگڑتے ہیں۔ اور بالآخر نک سک سے درست ہو کر وہ کمر میں تلوار لگا کر لڑکی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اسی اثنا میں رانی نے گنگا کے کنارے آکر منت مانی ہے۔ ہجوم کے مارے ایک ایک قدم چلنا مشکل ہے۔ ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ بیچارے غم نصیب ماں باپ دھکے میں کبھی دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ کبھی دس قدم پیچھے چلے جاتے ہیں۔

اُدھر لڑکی روتی ہوئی اپنے دھرم شالہ کو پہچاننے کی کوشش کرتی ہوئی دور چلی جا رہی ہے۔

دفعتاً کنور صاحب کو خیال آتا ہے کہ شائد لڑکی دھرم شالے میں پہنچ گئی ہو۔ نوکروں نے اُسے پا لیا ہو۔ دونوں فوراً بھیڑ کو ہٹاتے ہوئے

دھرم شالہ کی طرف چلتے ہیں۔ مگر وہاں پہنچ کر دیکھتے ہیں تو لڑکی کا پتہ نہیں۔ دونوں پھر گھبرا کر نکل پڑتے ہیں۔ دل لگی یہ ہے کہ آگے آگے لڑکی روتی چلی جاتی ہے۔ پیچھے پیچھے ماں باپ اس کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ بیچ میں صرف بیس گز کا فاصلہ ہے۔ مگر دونوں میں مڈبھیڑ نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ گھنٹوں گزر جاتے ہیں۔ بادل گھر آتا ہے۔ رانی تھک جاتی ہے۔ اس سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ جاتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ کنور صاحب لال لال آنکھیں نکالے حواس باختہ، ساری دُنیا پر جھلائے ہوئے ہیں۔

راجکماری مایوس ہو کر پھر ہردوار گھاٹ کی طرف چلتی ہے۔ اور ماں باپ کے سامنے سے نکل جاتی ہے۔ مگر دونوں کی نگاہیں دوسری طرف ہیں۔ آنکھیں چار نہیں ہوتیں۔

اتنے میں ایک جٹا دھاری مہاتما کن ہے پر مرگ چھالا ڈالے طنبورا ہاتھ میں لئے چلے آ رہے ہیں۔ راجکماری کو گھبرایا دیکھ کر وہ سمجھ جاتے ہیں۔ کہ یہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو گئی ہے۔ اُسے گود میں اٹھا لیتے ہیں اور اُس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھتے ہیں۔ لڑکی نہ اپنے والدین کا نام بتلا سکتی ہے، نہ اپنے گھر کا پتہ۔ وہ صرف رو رہی ہے۔ مارے خوف کے اسکی زبان ہی نہیں کھلتی۔

اب سادھو کے دل میں ایک نئی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ لڑکی کو گود میں لئے سوچ رہے ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اُن کا دل کہتا ہے۔ جب اس کے والدین کا پتہ ہی نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اُن کا نفس اس لڑکی کو چھپا رکھنے کی تحریک کرتا ہے۔ وہ راجکماری کو لئے اپنی کٹی کی طرف چلے جاتے

ہیں ... کی لڑکی اور بیوی دونوں مر چکی ہیں۔ اسی غم میں وہ دنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اس چاند سی لڑکی کو پاکر اُن کے دل میں پھر محبت پدری تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں پرماتما نے اُن پر رحم کھاکر یہ مشعل زندگی کو روشن کرنے کے لئے بھیجی ہے۔

(۲)

ایک کوہستانی مقام میں ایک صاف ستھری، بیلوں اور پھولوں سے آراستہ کٹی ہے۔ پشت کی طرف بہت گہرائی میں ایک دریا بہہ رہا ہے۔ کٹی کے سامنے چھوٹا سا میدان ہے۔ دو ہرن اور دو مور میدان میں پھر رہے ہیں وہیں مہاتما کٹی کے سامنے ایک چٹان پر بیٹھے طنبورے پر گا رہے ہیں راجکماری بھی اُن کے سُر میں سُر ملا کر گا رہی ہے۔ اس کی عمر اب دس سال کی ہوگی۔ بھجن گا چکنے کے بعد لڑکی پھول چُننے لگتی ہے۔ اور ایک مالا بناتی ہے۔ پھر کٹی میں جاکر ٹھاکر جی کو اشنان کراتی ہے۔ سادھو بھی آجاتے ہیں۔ اور دونوں ٹھاکر جی کی اُستت کرتے ہیں۔ پھر وہ وجد میں آکر ناچنے لگتے ہیں۔ ذرا دیر بعد لڑکی بھی رقص کرنے لگتی ہے۔ کیرتن ختم ہو جانے کے بعد دونوں چرن امرت لیتے ہیں۔ اور سادھو راجکماری کو جس کا نام اندرا رکھا گیا ہے پڑھانے لگتے ہیں۔ انہیں اس کو گانا۔ بجانا۔ ناچنا سکھانے اور پڑھانے میں روحانی لطف حاصل ہوتا ہے۔ ان کی دلی آرزو ہے کہ اندرا ایشور بھجن اور دنیا کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دے۔ وہ اس مبارک دن کا خواب دیکھتے ہیں۔ جب اندرا ٹھاکر جی کے سامنے میرا کی طرح گائے گی۔ اور وجد میں آکر ناچے گی۔ اندرا اتنی حسین، اتنی خوش گلو اور رقص کرنے میں اتنی مشتاق ہے کہ جب وہ رات کو کیرتن کرنے لگتی ہے۔ تو بھگتوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

مہاتماجی نے یہ پانچ سال اُسی کٹی میں کاٹے ہیں۔ اب اندرا سفر کی تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ اس لئے اب سادھو تیرتھ یاترا کرنے نکلتے ہیں۔ بھگت لوگ انہیں رخصت کرنے آتے ہیں۔ ایک بھگت کو وہ کُٹی سپرد کر دی جاتی ہے۔ اور مہاتماجی اندرا کے ساتھ تیرتھ یاترا کو روانہ ہو جاتے ہیں۔

مہاتماجی برسوں تک تیرتھ استھانوں کی یاترا کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بدری ناتھ جاتے ہیں، کبھی کیدارناتھ۔ کبھی دوارکا۔ کبھی رامیشور، کبھی متھرا، کبھی کاشی، کبھی پوری، ہر جگہ مندر میں دونوں کیرتن کرتے ہیں، اور عقیدتمندوں کو معرفت کے نشہ سے متوالا کر دیتے ہیں۔ اب مہاتما جی اندرا کو شاستر اور ویدوں کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اکثر جب مہاتما دھیان میں مگن ہو جاتے ہیں تو اندرا ویدوں کا مطالعہ کرتی ہے۔

(۳)

ایک دن مہاتماجی اور اندرا دونوں ایک گاؤں میں جا پہنچتے ہیں۔ یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے۔ ایک ہفتہ سے طاعون پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں کے باہر لوگ جھونپڑیاں ڈالے پڑے ہیں۔ مہاتماجی ایک درخت کے نیچے آسن جماتے ہیں۔ اور طاعون زدہ لوگوں کا معالجہ کرتے ہیں۔ اندرا بھی عورتوں کی خدمت میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جڑی بوٹیاں تلاش کرنا۔ دوائیں بنانا، مریضوں کو اٹھانا بٹھانا، ان کے بچوں کے لئے کھانے پینے کی فکر کرنا ان دونوں کا روزمرہ کا کام ہے۔ یہاں تک کہ مہاتماجی کو طاعون ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُسی درخت کے نیچے پڑ جاتے ہیں۔ گاؤں میں بیماری بہت کم ہو گئی ہے۔ زیادہ تر لوگ اچھے ہو گئے ہیں۔ اُس گاؤں کے سبھی زن و مرد اور قرب و جوار

کے مواضعات کے لوگ مہاتماجی کی تیمارداری کے لئے آتے ہیں۔ لیکن مہاتماجی کی حالت خراب ہوتی ہے۔ اور ایک دن وہ اندرا کو بلا کر ایشور بھجن اور عوام الناس کی خدمت کا اپدیش کر کے ٹھاکر جی کے چرنوں کا دھیان کرتے ہوئے سمادھی لے لیتے ہیں۔ گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے مہاتماجی کی ارتھی دھوم دھام باجے گاجے کے ساتھ نکلتی ہے۔ بھجن گانے والوں کی ایک منڈلی بھی ساتھ ہے۔ گاؤں کا چکر لگانے کے بعد اسی درخت کے سایہ میں ان کی چھتری بنتی ہے۔

اندرا کی عمر اس وقت بیس اکیس سال ہے۔ اور اس کے چہرہ پر ایسا جلال ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ اس کا مضبوط جسم ہر قسم کی سختیاں جھیلنے کا عادی ہو گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اسی گاؤں میں رہے۔ مگر اس سے اب اپنے محسن کی جدائی نہیں برداشت ہوتی۔ جس گاؤں میں اس پر یہ مصیبت پڑی اس میں وہ اب نہیں رہ سکتی۔ وہ دل کو اس خیال سے تسکین دینا چاہتی ہے کہ ایشور کو جو کچھ منظور تھا وہ ہوا۔ مگر کسی طرح تسکین نہیں ہوتی۔ آخر ایک دن میں وہ سب سے رخصت ہو کر نکل پڑتی ہے۔ اس کی کمر میں چھپی ہوتی کٹار ہے۔ ہاتھ میں طنبورا اور کمنڈل اور کندھے پر مرگ چھالا۔

وہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر ایشور کے بھجن سناتی اور عوام کے دلوں میں بھگتی اور سیوا کی شمع جلاتی پھرتی ہے۔ وہ جس شہر میں جا پہنچتی ہے۔ بات کی بات میں ہزاروں آدمی آجاتے ہیں۔ اس کی سواری کے لئے بہترین نعمتیں پیش کی جاتی ہیں۔ مگر وہ نمائش اور تکلف کو حقیر سمجھتی ہوتی کسی مندر کے سامنے درخت کے سایہ میں ٹھہرتی ہے۔ اور جو کچھ روکھا سوکھا میسر آ

جاتا ہے کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں وہ موہنی اداؤں میں وہ کشش ہے۔ کہ لوگ اُس کے منہ سے ایک ایک لفظ سننے کے لئے بیقرار رہتے ہیں۔ بڑے بڑے عیاش اور رنگین مزاج اس کے درشن کرتے ہی عقیدت سے اُس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ اندرا کو صوفی شعراء کا کلام بہت پسند ہے۔ میرا، کبیر وغیرہ کے دوہوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ہے اور انہیں کے بھجن گاتی ہے۔ تلسی اور سورداس کے پدوں سے بھی اُسے عشق ہے۔ حال کے شعراء میں اُسے جس کا کلام سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ ہری ہر نام کا ایک شاعر ہے۔ وہ اُس کے گیتوں کو پڑھ کر متوالی ہو جاتی ہے۔ اُس کے لئے اس کے دل میں خاص احترام ہے۔ وہ چاہتی ہے۔ کہ کہیں ہری ہر سے ملاقات ہو جاتی۔ تو وہ اُس کے قدموں کو بوسہ دیتی۔

(۴)

جرول ریاست کا خاص شہر کوہستانی علاقہ۔ صاف ستھری سڑکیں صاف ستھرے آدمی۔ عالی شان محلات۔ ایک نہایت خوشنما چوک۔ چاروں طرف روشنی جگمگاتی ہوئی دکانیں۔ وسط میں ایک پارک۔ پارک میں فوارا۔ اندرا اسی فوارے کے سامنے کھڑی طنبورے پر بھجن گا رہی ہے۔ ہزاروں آدمی محویت کے عالم میں کھڑے ہیں۔ جاتی ہوئی موٹریں رُک جاتی ہیں۔ اور اُس پر سے رؤسا اُتر اُتر کر گانا سننے لگتے خوانچے والے رُک جاتے ہیں۔ اور خوانچہ لئے بھجن سننے لگتے ہیں۔ اندرا اپنے پیارے شاعر ہری ہر کا ایک معرفت میں ڈوبا ہوا پد گا رہی ہے۔ اس کی مستانہ لے سب کو مست کر رہی ہے۔

۵

کئی سال ہوئے ہری ہر ایک متمول رئیس تھا۔ شعر و سخن کا دلدادہ، فلسفیانہ خیالات میں ڈوبا ہُوا، تصوف میں رنگا ہُوا اپنے عالیشان محل کو چھوڑ کر ایک جھونپڑی میں بیٹھا تصوف اور فلسفہ کے جذبات کو شعر اور نغمہ کے دل فریب رنگ میں ادا کیا کرتا تھا۔ معرفت کی حقیقتیں اس کے دل و دماغ میں جا کر صفاتِ شعری سے آراستہ ہو جاتی ہیں۔ ساری رات بیٹھے گزر گئی ہے، اور وہ اپنے خیالات میں مست ہے۔ کھانے پینے، کپڑے لتے کی فکر نہیں۔ دنیا اس کی نظروں میں خواب ہے۔ محض سراب آرزو۔ اس کی کوئی چیز اس کے خیال میں ایسی نہیں کہ انسان اس میں دل لگائے۔ وہ اپنی ملکیت اور جائداد کی پروا نہیں کرتا۔ کاروبار کی طرف مطلق دھیان نہیں دیتا۔ کاروباری لوگ اس سے بار بار ملنے آتے ہیں۔ وہ اپنے گوشۂ عافیت سے باہر نہیں نکلتا۔ ہاں اگر کوئی پھٹے حال آ جاتا ہے۔ تو فوراً آ کر اسے مہمان خانہ میں لے جاتا ہے۔ غربا کے لئے اس کی ساری ثروت وقف ہے۔ کبھی غریبوں کو کمبل تقسیم کرتا ہے۔ کبھی غلّہ۔ کوئی بھوکا سائل اس کے دروازے سے مایوس نہیں جانے پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قرضہ سے زیربار ہو جاتا ہے۔ قرضخواہ نالشیں کرتے ہیں، اُس پر ڈگری ہوتی ہے۔ ہری ہر کبھی اپنا گوشۂ تنہائی چھوڑ کر مقدمہ کی پیروی کرنے نہیں جاتا۔ اس کی جائداد قرق ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ستار پر ایک بدگا رہا تھا۔ جو اس نے ابھی ابھی تصنیف کیا تھا۔ سجاوٹ اور تکلف کی چیزیں اس کے محل سے نکالی جاتی ہیں۔ اور نیلام کر دی جاتی ہیں۔ اُسے مطلق غم نہیں۔ تب اس کا محل نیلام ہوتا ہے۔ وہ اُسی طرح بے اثر رہتا ہے۔ اس محل میں آ کر ایک بہت بڑا

رئیس قبضہ جما لیتا ہے۔ ہری ہر کے پاس اب بھی وسیع علاقہ ہے وہ چاہے تو پھر شاندار محل بنوا سکتا ہے۔ مگر اُسے ملکیت سے محبت نہیں، وہ ہر ایک گاؤں میں گھوم گھوم کر اپنی اسامیوں کو زمینداری کے حقوق عطا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے ۱۰۱ مواضعات سب آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ جس گاؤں میں جا نکلتا ہے لوگ اس کا استقبال کرتے دوڑتے ہیں۔ اور اُس کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگاتے ہیں، اُس کے لئے ہر نعمت حاضر کی جاتی ہے۔ لیکن وہ گاؤں کے باہر کسی درخت کے سایہ میں مقیم ہوتا ہے۔ اور جنگلی پھل کھا کر سو رہتا ہے۔ آخر ملکیت کی فکر سے آزاد ہو کر وہ اطمینان سے پھر اپنے گوشۂ عافیت میں آبیٹھتا ہے آج اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کی کٹی میں اب بھی کتنی ہی فالتو چیزیں ہیں۔ جنہیں اس کی نفاست پسند طبیعت نے جمع کر رکھا ہے مصوری اور صنعت کے ان کمالات کو جمع کر کے وہ ایک ڈھیر لگاتا ہے۔ اور اس میں آگ لگا دیتا ہے۔ اس کا ستار اور طنبورا اور دف، مورنیں، مرگ چھالے، تصوف اور فلسفیوں کی کتابیں سب اس ڈھیر میں جل کر خاک ہو جاتی ہیں وہ متبسم کھڑا ان چیزوں کو خاک ہوتے ہوتے دیکھتا ہے۔

(۶)

شام ہو گئی ہے۔ شہر کے چوک میں اندرا اپنے طنبورے پر ایک پد گا رہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہے۔ بڑے بڑے رؤسا اور امراء محو کھڑے ہیں۔ ہری ہر وہ نغمۂ دل نواز سن کر چونک پڑتا ہے۔ کان لگا کر سنتا ہے اور تب لپک کر مجمع کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اندرا اسی کا پد گا رہی ہے۔ اُس کی ایک ایک تان اُس کے دل پہ چوٹ کرتی ہے۔ ہری ہر کو آج اپنے کلام کی گہرائی، درد، اور تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ نقشِ حیرت بنا ہوا کھڑا رہتا ہے

یہاں تک کہ گانا ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ اندرا بھی وہاں سے چلی جاتی ہے۔ مگر ہری ہر ابھی تک وہیں مورت کی طرح خیال میں ڈوبا ہوا ہے۔ بےحس و حرکت کھڑا ہے جب بالکل سناٹا چھا جاتا ہے۔ تو اُسے اپنے گرد و پیش کی خموشی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دو ایک آدمیوں سے اندرا کا پتہ پوچھنا چاہتا ہے مگر جھجک کے مارے نہیں پوچھتا۔ مجبور ہو کر وہ اپنی کٹی میں لوٹ جاتا ہے اور پریم کا پہلا گیت لکھتا ہے۔ وہ ساری رات ایک بیتابی کے عالم میں کاٹ دیتا ہے۔ اور دوسرے دن شام کو پھر چوک کی طرف جاتا ہے۔ آج بھی اندرا چوک میں گا رہی ہے۔ ہجوم کل سے کئی گنا زیادہ ہے مگر کیا مجال، کہ کوئی جنبش کر سکے۔ ہری ہر بھی بُت بنا ہوا سنتا ہے۔ اور جب آدھ گھنٹہ کے بعد اندرا چلی جاتی ہے۔ تو وہ اُس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ عقیدتمندوں کا ایک اژدحام ساتھ ہے۔ کٹی کے قریب پہنچ کر اندرا سب آدمیوں کو رخصت کر دیتی ہے۔ صرف ہری ہر اُس کے کچھ فاصلے پر چلا آ رہا ہے۔ اندرا اپنی کٹی میں پہنچ کر پانی بھر لاتی ہے۔ اور تب ٹھاکر جی کا بھوگ لگا کر خود کھاتی ہے پھر زمین پر پڑ رہتی ہے۔

سفید چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ ہری ہر کٹی کے سامنے زمین پر بیٹھ کر پتھر کے ٹکڑوں پر کوئلے سے تازہ عشق و محبت کا گیت لکھنے لگتا ہے۔ ساری رات لکھتے گزر جاتی ہے۔ جب مشرق کی طرف طلوع سحر کی سرخی نمودار ہوتی ہے۔ تو وہ سنگریزوں کو کٹی کے دروازے پر ترتیب سے رکھ کر وہاں سے کچھ دور ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ جاتا ہے۔ سنگریزے اس طرح رکھے گئے ہیں۔ کہ اندرا کو اس کا پیغام محبت پڑھنے میں بالکل تردد نہ ہو۔

علی الصبح اندرا سندھیا پوجن اور کیرتن کے بعد جب باہر نکلتی ہے تو

عین دروازے پر اُسے چکور سنگریزے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں،
وہ حیرت میں آکر ایک پتھر اٹھا لیتی ہے۔ اُس پر اُسے کوئی تحریر نظر آتی ہے۔ ارے!
یہ کوئی پریم کا نغمہ ہے! وہ دوسرا پتھر اٹھاتی ہے۔ اس پر بھی وہی تحریر ہے۔
وہ اس گیت کا دوسرا بند معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ سارے سنگریزوں کو اٹھا کر
پڑھتی ہے۔ اور انہیں ایک قطار میں رکھ کر پورا گیت پڑھ لیتی ہے۔ اس گیت
میں وہ درد اور تاثیر ہے کہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی ہے۔ یہ اُسی زندہ جاوید ہری ہر
کا کلام ہے۔ کتنی ہی بار اندرا کے دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اس شاعر
کا درشن کرے۔ لیکن اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ کون ہے کہاں رہتا ہے۔ آج یہ پیغام
محبت پاکر وہ دیوانہ وار اُس کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ وہ کہیں قریب
ہوگا۔ اس کا اُسے یقین ہے۔ وہ چاروں طرف اُسے تلاش کرتی ہے اور
آخر وہ کٹی کے عقب میں زمین پر اُسے سوتا ہوا نظر آتا ہے، وہ حیرت آمیز
مسرت سے اُس کے چہرہ کی طرف دیکھتی ہے مکھیاں اُسے ستا رہی ہیں۔
یہ دیکھ کر وہ اپنے آنچل سے مکھیاں اڑانے لگتی ہے۔ ہری ہر کی نیند کھل جاتی
ہے اور اندرا کو آنچل سے پنکھا جھلتے دیکھ کر وہ اس محبت کا مزہ لینے کے لئے
پڑا رہتا ہے۔ تب وہ اُٹھ کر بیٹھتا ہے۔ اندرا اُسے پرنام کرتی ہے۔

اب ہری ہر بھی وہیں رہتا ہے۔ وہ کٹی کے اندر رہتی ہے ہری ہر باہر۔
دونوں ساتھ پہاڑیوں کی سیریں کرتے، جنگلی پھول پھل جمع کرتے، پہاڑیاں اندرا
کے نغموں سے گونج جاتی ہیں۔ دونوں ساتھ ٹھاکر جی کے بڑے مندر میں
کیرتن کرنے جاتے ہیں۔ وہ اب شہر کے چوک میں اپنا راگ سنانے نہیں آتی۔
اب اس کے سننے والا صرف ہری ہر ہے۔ مگر شہر کے عقیدت مندوں کی اب بھی
بھیڑ لگ جاتی ہے۔ اور لوگ تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں۔ جنہیں اندرا

فیاضی سے غربا میں تقسیم کر دیتی ہے۔

(۷)

صبح کا وقت، جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ہوئی اندرا گا رہی ہے اور ہری ہر سامنے بیٹھا ہوا ٹھاکر جی کے لئے ایک ہار گوندھ رہا ہے جھیل میں مرغابیاں ہنس وغیرہ تیر رہے ہیں۔ کناروں پر ہرن، نیل گائے وغیرہ سب گویا اس نغمہ سے مست ہو رہے ہیں۔

یکایک راجکمار گیان سنگھ گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرتا ہے، اس کے ساتھ کئی برق انداز۔ شکاری اور مصاحب ہیں۔ نہایت شکیل مردانہ صورت کا نوجوان ہے۔ ابھی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ اونچا قد۔ فراخ سینہ اونچی پیشانی اندرا کا نغمہ سنتے ہی اُسے جیسے سکتہ سا ہو جاتا ہے۔ اس کا گھوڑا وہیں رک جاتا ہے۔ اور سارا مجمع چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اندرا معرفت کے نشہ میں ڈوبی ہوئی ہے، اُسے گیان سنگھ کے آنے کی مطلق خبر نہیں ہوتی جب گانا ختم ہو جاتا ہے تو راجکمار گھوڑے سے اُتر پڑتا ہے، اور اندرا کے پاس آکر ادب سے پرنام کرتا ہوا اُس کا نام دریافت کرتا ہے۔ وہ اب تک بن بیاہا تھا صدہا پیغامات راجوں مہاراجوں کے یہاں سے آئے تھے۔ اس نے ایک بھی منظور نہ کیا۔ آج اس حسینہ کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے وہ اُسے ادب کے ساتھ اپنے محل میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اندرا ایک دن کی مہلت مانگتی ہے۔ گیان سنگھ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے لیکن شکار میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا۔ اُسے یکایک شکار سے نفرت اور ہر ایک جاندار سے اُنس ہو جاتا ہے۔ اُسے اب ہرنوں کا شکار کرتے صدمہ ہوتا ہے۔ وہی نغمہ درد اُس کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اور

آنکھوں میں وہی صورت بسی ہوئی ہے۔

(۸)

اندرا یہ دعوت پاکر خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ اُسے اُس شعلہ کی مطلق خبر نہیں ہے۔ جو اُس کے حسن اور نغمہ نے گیان سنگھ کے دل میں روشن کر دیا ہے۔ وہ سوچتی ہے۔ شاہی عنایات کی بدولت وہ زندگی کے تفکرات سے آزاد ہو جائے گی۔ اور ہری ہر کے ساتھ گوشہ قناعت میں بیٹھی ہوئی زندگی کے دن کاٹ دیگی۔ ہری ہر خیال کرتا ہے۔ کہ اندرا تو اس میں کتنی خوش ہوگی کیونکہ راجکمار کے دل کی کیفیت اس سے مخفی نہیں رہتی۔ کیا ایسی بےمثال حسینہ کوہ و بیابان میں پھرنے کے قابل ہے۔ اسے ایشور نے کسی راجہ اس کی زینت بننے کے لئے ہی بنایا ہے۔ ہری ہر کے ساتھ رہ کر اُسے فقر اور فاقہ کے سوا اور کیا نصیب ہوگا۔ وہ اس دیوی کو ان آزمائشوں میں نہیں جا ہتا۔ اُس کی روحانی تسکین کے لئے اتنا ہی یقین کافی ہے۔ کہ اندرا کے دل میں اس کی جگہ ہے۔ یہی خیال اس کی زندگی کو معراج کمال تک پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ اُس کے دل میں اور کوئی خواہش کوئی آرزو نہیں ہے۔

رات گزر جاتی ہے علی الصباح ہری ہر پھولوں کے زیوروں سے اندرا کو آراستہ کرتا ہے۔ اُس دن اندرا کو عقیدتمندوں نے جتنے تحفے پیش کئے ہیں۔ وہ سب ہری ہر نے جمع کر رکھے ہیں۔ وہ اندرا کے حسن کو ان آرائشوں سے اور بھی چمکا دیتا ہے۔ مگر جب موقعہ مل جاتا ہے۔ تو اندرا کی آنکھیں بچا کر آنسوؤں کی دو چار بوندیں بھی گرا لیتا ہے۔ اندرا سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ گویا اُسے کوئی اندیشہ نہیں۔ مگر دل میں اُسے یقین ہے کہ اب پھر اندرا کے درشن نہ ہوں گے۔ یہ خوف بھی ہے کہ اندرا کے دل میں ایسا

اس کی یاد نہ رہے گی۔ شاہی عیش و عشرت میں پڑھ کر وہ اُسے یقیناً بھُول جائیگی۔ کون کس کو یاد کرتا ہے۔ لیکن وہ اس خیال سے اپنے دل کو تسکین دیتا ہے کہ وہ تو آرام سے رہیگی۔ رعایا کو اس کی ذات سے فیض پہنچے گا۔ کیا وہ اس قدر تبدیل ہو جائے گی کہ اختیار پاکر شاہی جور و ستم کے خلاف زبان نہ کھولے، کیا وہ مہاتما کے اُپدیش کو فراموش کر سکتی ہے؟

جب اندرا بن سنور کر تیار ہو جاتی ہے تو دونوں ساتھ بیٹھ کر کیرتن کرتے ہیں۔ آج اس کیرتن میں دونوں کے دلوں میں مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اندرا بے خبری میں خوش ہے۔ اُسے اپنے روبرو بہار ہی بہار نظر آرہی ہے وہ سنیاس اور ویراگ سے سیر ہو چکی ہے۔ اور اب دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھانا چاہتی ہے۔ اس کے خیال میں شاہی عنایتیں اس کے لئے آسائش کا دروازہ کھول دیں گی۔ وہ اس وقت بھی اس زندگی کا خواب دیکھ رہی ہے۔ جب وہ ہری ہر کے لئے اچھے کھانے پکائے گی، اس کے لئے اچھے اچھے کپڑے بنوائے گی۔ اس کے سر میں تیل ڈالے گی۔ جب وہ سوئے گا۔ تو اس کے لئے پنکھا جھلے گی۔ کیا ایسا با کمال خدا رسیدہ شاعر اس قابل ہے کہ دنیا کی ناقدری کا شکار رہے۔ مگر ہری ہر غمناک خیالات میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے سامنے تاریک مستقبل ہے۔ اسی وقت گیان سنگھ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سواری لئے آپہنچتا ہے۔

(۹)

شاہی محل کے آراستہ اور پُر تکلف کمرے حسین کنیزیں، راج ماتا کا دربار لگا ہوا ہے۔ اندرا محل میں پہنچ کر راج ماتا کو پرنام کرتی ہے رانی اس کی بڑی خاطر و مدارات کرتی ہیں۔ وہ اشنان کئے ہوئے پوجا کے لئے تیار بیٹھی ہوتی

اندرا اُن کے ساتھ مندر میں جاتی ہے۔ جو شیشہ و آلات سے سجا ہوا ہے۔ اور وہاں اُن کا کیرتن ہوتا ہے۔ اور بھی کئی شریف زادیاں رانی کے ساتھ ہیں سب اندرا کا کیرتن سن کر بیخود ہو جاتی ہیں۔ رانی صاحبہ اندرا کو گلے لگا لیتی ہیں اور اپنی موتیوں کی مالا نکال کر اُس کی گردن میں ڈال دیتی ہیں۔ اندرا دوسرا بھجن گاتی ہے۔ رانی اس کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہیں۔ بھگوان سے ایسی بھگتی کبھی اُس کے دل میں نہ اٹھی تھی۔ اسی وقت پدما آتی ہے۔ پدما حسن میں اندرا سے بالکل جدا ہے۔ اُس کے حسن میں رعب، تمکنت، ملاحت اور کشش ہے۔ اندرا کے حسن میں نزاکت اور انکسار ایک چنبیلی کا پھول ہے۔ سادہ اور نازک، اس کا حسن اس کی نزاکت اور سادگی میں ہے۔ دوسرا سورج مکھی ہے۔ خوش رنگ اور نظر فریب پدما کا باپ سردار کیسری سنگھ راج میں وزارت کے عہدے پر مامور ہے۔ وہ پدما کی شادی راجکمار گیان سنگھ سے کرنا چاہتا ہے پدما بھی راجکمار کو سچے دل سے چاہتی ہے۔ مگر راجکمار اُس کی طرف زیادہ مائل نہیں ہے۔ پھر بھی اُس کی بہت خاطر اور دلجوئی کرتا ہے۔

پدما آکر راجکمار کو اندرا کی طرف گرویدہ نظروں سے تاکتے دیکھتی ہے۔ یہ بھی دیکھتی ہے کہ یہاں اس کی قدر و منزلت ہو رہی ہے۔ خود اس کی اتنی قدر کبھی نہ ہوتی تھی۔ یہ معمولی بازاروں میں گانے والی عورت اُس سے بازی لے جائے۔ اس خیال سے وہ دل میں جل جاتی ہے۔ اندرا سے اُسے فوراً حسد و رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُسے ذلیل کرنے کے منصوبے باندھنے لگتی ہے وہ رانی صاحبہ کو اس سے بدگمان کرنا چاہتی ہے۔ اس کی شکل اور صورت وضع و قطع کا مذاق اڑاتی ہے۔ مگر جب اس بداندیشی کا اندرا پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تو وہ اُسے بدنام کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنا بیش قیمت کنگن موقع پا کر اُس کے

طنبورے کے نیچے چھپا دیتی ہے۔ اور ذرا دیر بعد اُسے تلاش کرنے لگتی ہے۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈتی ہوئی وہ اندرا کے پاس آتی ہے اور طنبورے سے کنگن نکال لیتی ہے۔ اندرا شرمندہ ہوکر رونے لگتی ہے۔ کنیزیں پدما سے بہت خوش رہتی ہیں۔ کیونکہ پدما انہیں انعام دیتی رہتی ہے۔ وہ سب اندرا سے بدگمانی ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن اُسی وقت گیان سنگھ آجاتا ہے۔ اور اس واقعہ کی خبر پاکر اندرا کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا ہے۔ اُسے اس معاملہ میں فتنہ انگیزی اور شرارت نظر آتی ہے۔ اندرا کی طرف سے وہ کسی قسم کی بدنیتی کا خیال ہی دل میں نہیں لاسکتا۔ اُس کا رُخ دیکھ کر کنیزیں بھی اُسی کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ اور رانی صاحبہ پدما کو سخت سُست کہتی ہیں۔ پدما دانت پیس کر رہ جاتی ہے۔

اِدھر ہری ہر شاہی محل کی دیوار کے نیچے خود فراموشی کی حالت میں کھڑا ہے کہ شائد اندرا کی آواز کانوں میں پڑ جاتی۔ یہاں سے مایوس ہوکر وہ پھر اندرا کی کٹی میں جاتا ہے۔ اور اُس کی ایک ایک چیز کو لے کر چومتا ہے۔ اور روتا ہے۔

دوسرے دن محل میں پھر محفل آراستہ ہوتی ہے۔ آج مہاراجہ صاحب جردل بھی رونق افروز ہیں۔ اتفاق سے سانگلی کے کنور صاحب بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اُن چودہ پندرہ برسوں میں اُنہوں نے بڑے بڑے صدمے اُٹھائے ہیں۔ اُن کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ بیوی اور بیٹی کی یاد میں بہت لاغر ہوگئے ہیں۔ مگر آرائش کا شوق ابھی تک قائم ہے۔ اب بھی وہی جے پوری صافا ہے۔ وہی نیچی اچکن، وہی امرت سری جُوتا۔ اُسی طرح بال سنوارے۔ حالانکہ ان ظاہری آرائشوں کے نیچے روتا ہوا دل ہے

اندرا جس وقت محو ہو کر گاتی ہے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ انہیں اندرا کی صورت میں اپنی جنّت نصیب بیوی کا عکس نظر آتا ہے۔ پہلی بار جب انہوں نے اندرا کی ماں کو نویلی دُلہن کے روپ میں دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ ہوبہو ایسی ہی تھی۔ اتنی مشابہت آج تک انہوں نے کسی عورت میں نہیں دیکھی۔ جب اندرا یہاں سے جانے لگتی ہے۔ تو وہ کئی قدم اُس کے ساتھ جاتے ہیں۔ اور موقعہ پا کر اُس کا نام اور والدین کا حال پوچھتے ہیں۔ اندرا اپنے بچپن کا واقعہ اُن سے بیان کرتی ہے۔ کنور صاحب کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ اندرا میری ہی کھوئی ہوئی بیٹی ہے۔ اُن کے دل میں بے اختیار ولولہ اُٹھتا ہے کہ اُسے گلے سے لگا لیں۔ مگر شرم مانع ہوتی ہے۔ کیا خبر ہے یہ کس کس کے ساتھ رہی۔ اس پر کیا کیا گزری۔ وہ اُسے اپنی لڑکی کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ اندرا بھی غور سے اُس کے چہرے کو دیکھتی ہے۔ اور اُسے کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ کہ اُس کے باپ کی شکل اُن سے ملتی تھی۔ لیکن وہ بھی شرم سے اس کا اظہار نہیں کرتی۔ کہ کہیں کنور صاحب انکار کر دیں تو خفت ہو۔

راجہ صاحب جرول اندرا کے کیرتن سے اتنے خوش ہوتے ہیں، کہ اُسے پانچ موضع معافی عطا کر دیتے ہیں۔ اندرا اُن کے قدموں پر گر کر احسانمندی کا اظہار کرتی ہے۔

(۱۰)

راجکمار اپنی کشتی آراستہ کرتا ہے۔ اور اندرا کو دریا کی سیر کے لئے لے جاتا ہے۔ اندرا اس موقع کی منتظر ہے کہ راجکمار سے ہری ہر کی سفارش کر کے اُسے درباری شاعر کا رتبہ دلا دے۔ اس لئے باوجودیکہ اُس کا دل یہاں سے جانے کے لئے بیتاب ہے اور ہری ہر کی جدائی اُسے شاق گزر رہی ہے۔

مگر وہ جانے کا نام نہیں لیتی۔ دریا کی سیر میں شائد وہ موقعہ ہاتھ آجائے۔ اس لئے وہ اس تجویز کو خوشی سے منظور کر لیتی ہے۔ کشتی لہروں پر خوش فعلیاں کر رہی ہے۔ اندرا ہری ہر کا ایک پد گانے لگتی ہے۔ دفعتاً اُسے کنارے پر ہری ہر کھڑا نظر آجاتا ہے۔ اُس کی صورت سے ایسی مایوسی برس رہی ہے۔ گویا یہ دائمی مفارقت ہے۔

راجکمار کا دل اس پریم کے پد سے مدہوش ہو جاتا ہے۔ اُسے اب صبر کی تاب نہیں رہتی۔ وہ اندرا کے روبرو اپنے دلِ بیتاب کی داستان سُناتا ہے۔ وہ اپنا دل اس کی نذر کرتا ہے۔ اندرا کو اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سنہرے جال میں پھنس گئی ہے۔ اب ہری ہر کا نام بھی زبان پر لانا قہر ہو جائے گا۔ راجکمار فوراً ہری ہر کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ وہ دل میں افسوس کرتی ہے کہ ناحق راجکمار کی دعوت قبول کی۔ یہ ہوس کا پہلا تازیانہ ہے۔ جو اُس پر پڑا ہے۔ وہ اب یہ بھی سمجھنے لگی ہے کہ گو راجکمار اُس کے روبرو سائل کی حالت میں کھڑا ہے۔ مگر فی الواقع وہ اس کی قید میں ہے۔

وہ کہتی ہے "راجکمار! میں غریب عورت ہوں۔ اس قابل نہیں کہ تمہاری رانی بنوں کہ تم بدنام ہو جاؤ گے۔ اور عجب نہیں کہ راجہ صاحب اور تمہاری ماتا جی بھی تم سے ناراض ہو جائیں۔ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ میں تمہیں مصیبتوں میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔"

راجکمار: "میں تمہارے لئے تخت و تاج پر لات مار دونگا۔ اندرا مجھے کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پروا نہیں ہے۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو حاضر ہوں۔"

اندرا بہانہ کرتی ہے کہ اُس نے سنیاس برت دھارن کر لیا ہے، اور اگر

اُس نے عہد کی خلاف ورزی کی تو اُس بہاتما جی کو کتنی تکلیف ہو گی۔ جنہیں وہ اپنا گورو سمجھتی ہے۔ سورگ میں بھی انہیں اُس کی یہ حرکت دل شکستہ کر دے گی۔ وہ راجکمار کی عزت کرتی ہے۔ لیکن محبت کرنا اس کے لئے ممنوع ہے۔ اور وہ اپنے عہد کو توڑ نہیں سکتی۔

راجکمار:" تمہیں میرے اوپر مطلق رحم نہیں آتا اندرا؟"

اندرا:" میں اپنے عہد کو توڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی"

راجکمار:" یہ سب حیلے ہیں۔ اندرا! کیا میں خیال کروں۔ تمہارے دل میں کسی دوسرے کے لئے جگہ ہے؟"

اندرا:" میں نے آپ سے کہہ دیا۔ میں سنیاستی ہوں"

راجکمار:" یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

اندرا:" ہاں آخری"

راجکمار مایوسی کے عالم میں کمر سے تلوار نکال کر اپنے سینہ میں چبھونا چاہتا ہے۔ اندرا تیزی سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔

راجکمار:" مجھے مر جانے دو اندرا۔ جب میں تمہیں زندگی میں نہیں پا سکتا۔ تو زندگی بیکار ہے"

اندرا اس کی کمر میں تلوار لگاتی ہوئی دلجوئی کے لئے کہتی ہے۔" میرے جیسی ہزاروں عورتیں آپ کو ملیں گی۔ ایک غریب تپسونی کا پریم آپ کو مل بھی جائے۔ تو آپ کو اس سے تشفی نہ ہو گی"

راجکمار کا چہرہ مسرت سے کھل جاتا ہے۔ کہتا ہے۔" محبت تو عہد اور برت کی پروا نہیں کرتی"

اندرا:" لیکن محبت چھومنتر سے پیدا ہونے والی چیز بھی تو نہیں۔ جو محبت

ایک نگاہ سے پیدا ہو سکتی ہے، وہ ایک نگاہ میں فنا بھی ہو سکتی ہے تم راجکمار ہو۔ مجھے کیا بھروسہ ہے کہ مجھ سے زیادہ حسینہ اور جمیلہ عورت پاکر تم میری طرف سے آنکھیں پھیر نہ لو گے۔ پھر تو میں کہیں کی بھی نہ رہوں گی۔ وصال صنم کے لئے خدا کو چھوڑ کر اگر نامراد رہوں تو کیا ہو؟"

"راجکمار:۔ ہاں تمہاری یہ شرط مجھے منظور ہے۔ اندرا مجھے موقعہ دو۔ کہ میں اپنی محبت کا نقش تمہارے دل پر جما سکوں۔ لیکن اگر تم مجھ سے منہ موڑ کر چلی گئیں۔ تو دیکھ لینا۔ اسی دن تمہیں میرے مرنے کی خبر ملے گی۔"

اندرا دیکھتی ہے کہ ہری ہر آہستہ آہستہ دریا کے کنارے سے بستی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اپنی بے کسی اور مایوسی کا خیال کر کے اُس کی آنکھیں آبجوں ہو گئیں۔

(۱۱)

پدما آسانی سے اپنی آرزوؤں کا خون نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اندرا کے متعلق تحقیقات شروع کرتی ہے کہ شائد کوئی ایسا پہلو ہاتھ آجائے۔ جس کی بنا پر وہ اُسے راجکمار کی نظروں سے گرا دے۔ ایک دن وہ اس کی قیام گاہ کا پتہ دریافت کرتی ہوئی اس کی کُٹی تک جا پہنچتی ہے۔ وہاں ہری ہر سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ اندرا کی بے وفائیوں کی داستان ہری ہر سے بیان کرتی ہے۔ اُس نے کئی تصویریں اُتروا لی ہیں۔ جن میں اندرا کا راجکمار کے ساتھ سیر کرتا۔ گانا بجانا۔ لکھنا۔ پڑھنا نظر آتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اندرا وہاں ایسی خوش ہے گویا اُسے کائنات کی دولت مل گئی ہو۔ اور تم اُس کے فراق میں گھُل رہے ہو۔ ایسی بے وفا عورت اسی قابل ہے کہ اس کی قلعی کھول دی جائے۔ تاکہ وہ کہیں اپنا روئے سیاہ نہ دکھا

سکے۔ لیکن ان بدگوئیوں کا ہری ہر پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ آخر ادھر سے مایوس ہو کر پدما ایک دوسرا جال پھیلاتی ہے۔ وہ ہری ہر کو اپنے ساتھ دربار میں لاتی ہے۔ اور راجکمار سے اس کا تعارف کراتی ہے۔ راجکمار اس کا کلام سن کر بہت محظوظ ہوتا ہے۔ یہ وہی کلام ہے جو اس نے اندرا کے منہ سے سُنا ہے۔ راجکمار اس کی بڑی خاطر کرتا ہے۔ پدما ہری ہر کی زبان سے ایسے الفاظ نکلوانا چاہتی ہے۔ جو اس کی محبت کا پردہ فاش کر دیں۔ اور راجکمار کو معلوم ہو جائے۔ کہ یہ اندرا کا عاشق ہے۔ لیکن ہری ہر اتنا محتاط ہے کہ وہ ایک لفظ بھی ایسا منہ سے نہیں نکلنے دیتا جس سے محبت کا اظہار ہو۔ راجکمار اندرا کی تعریف کرتا ہے۔ ہری ہر اس طرح سنتا ہے۔ گویا اس نے اندرا کا نام بھی نہیں سنا۔ پدما اسی وقت رنواس میں جا کر اندرا کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اسے یقین ہے۔ کہ دونوں بروقت ملاقات ضرور ایسے خوش ہو جائیں گے۔ کہ اس ضعیف بنیاد پر کوئی تعمیر کھڑی کی جا سکے گی۔ لیکن اندرا ہری ہر کو دیکھ کر بیگانہ وار پیش آتی ہے۔ اور ہری ہر بھی اس سے زیادہ مخاطب نہیں ہوتا۔ تب پدما ایک مشاعرہ منعقد کرتی ہے۔ اور اس میں ریاست کے بڑے بڑے خوشگوار شعرا کو مدعو کرتی ہے۔ یہ تجویز پیش کی جاتی ہے۔ کہ جس کا کلام بہترین ہو اُسے درباری شاعر کا منصب عطا کیا جائے۔ پدما کو یقین ہے۔ کہ ہری ہر کا کلام گوئے سبقت لے جائیگا۔ اس لئے وہ اندرا کو منصف قرار دیتی ہے۔ راجکمار بھی بڑی خوشی سے اندرا کا منصف بنایا جانا منظور کرتا ہے۔ اندرا کو اب صاف نظر آ رہا ہے۔ کہ اُس کی تباہی کے سامان کئے جا رہے ہیں۔ ہری ہر کا کلام یقیناً بہترین ہو گا۔ اور اُسے مجبوراً اُسی کو فائق کہنا پڑے گا۔ ہری ہر کی حمایت یا سفارش میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا اس کے لئے زہر قاتل

کا کام دے سکتا ہے۔ اس کے فیصلہ پر اعتراض کرنا اور ہری ہر کے کلام میں نقائص نکال کر راجکمار کو اندرا سے بدظن کر دینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر موقع ملے تو ہری ہر کو آگاہ کر دے۔ مگر یہ موقع اُسے نہیں ملتا۔ پدما مشاعرہ کی تیاریوں میں مصروف رہتی ہے۔ مقررہ تاریخ کو سبھی شاعر تشریف لاتے ہیں۔ ہری ہر بھی آتا ہے۔ شرط تازہ کلام کی ہے۔ ہری ہر نے کوئی تازہ نظم نہیں لکھی۔ اور شعرا اپنے کلام سناتے ہیں۔ نعرۂ تحسین بلند ہو جاتا ہے بالآخر جب ہری ہر کی باری آتی ہے۔ تو وہ صاف کہہ دیتا ہے۔ میں نے کوئی تازہ نظم نہیں لکھی۔ اس نے بھی پدما کی اِن سرگرمیوں کو اپنی فراست سے تاڑ لیا ہے۔ اور اُس کے جال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اندرا اُسے تائیدِ غیبی سمجھ کر پرماتما کا دل میں شکریہ ادا کرتی ہے۔ انعام اور منصب ایک دوسرے شاعر کو مل جاتے ہیں۔ اور اندرا کی محبت کا راز سربستہ رہ جاتا ہے۔ ہری ہر یہاں سے بہت خوش خوش رخصت ہوتا ہے۔ اندرا تو اس میں خوش و خرم ہے اس سے زیادہ مسرت کی بات اس کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔

(۱۳)

راجکمار گیان سنگھ کی گدی نشینی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ شہر میں چراغاں ہو رہا ہے۔ چورستوں پر عالیشان پھاٹک بنائے گئے ہیں۔ جن پر نوبت بج رہی ہے۔ شاہی محلات اور دفاتر خوب آراستہ کئے گئے ہیں۔ صدر پھاٹک سے چوک تک دو رویہ بجلی کے خوشرنگ بلب لگائے گئے ہیں۔ کناروں کے درختوں پر بجلی کی روشنی کے حروف میں دعائیہ کلمات لکھے گئے ہیں۔ پنڈت لوگ مہورت دیکھتے ہیں۔ اُسی وقت گیان سنگھ محل سے نکل کر عالیشان منڈپ میں آتا ہے جو اسی تقریب کے لئے نصب کیا گیا ہے۔ اراکین دربار اور رؤسا

نذرانے پیش کرتے ہیں۔ گیان سنگھ اٹھ کر اپنے طرزِ عمل کا اعلان اور ملازمانِ شاہی و نیز رعایا کو اپنے فرائض کی پابندی کی ہدایت کرتا ہے۔ اسامیوں کا نصف لگان اس نے معاف کر دیا ہے۔ اس لئے رعایا بیحد خوش ہے۔ سب اظہارِ مسرت کر کے اس کو دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پھر غربا کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ قیدیوں کی رہائی کا حکم ہوتا ہے۔ تب فوجوں کی سلامی اور قواعد ہوتی ہے۔ بینڈ بجتا ہے۔ افسروں کو تمغے اور پروانے ملتے ہیں۔ پھر آتش بازیاں چھوڑی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ٹھاکر دوارے میں کیرتن ہوتا ہے۔ ہری ہر وہاں اندرا کے درشنوں کے اشتیاق میں آیا ہے۔ مگر کیرتن کرنے والوں میں اندرا نہیں ہے۔ طوائفوں کو مطلق مدعو نہیں کیا گیا۔ جیسا عام دستور تھا۔ گیان سنگھ نے اس تقریب میں بھی بیجا صرف نامنظور کر دیا ہے۔ شہر میں خبر گرم ہے کہ اندرا کی شادی گیان سنگھ سے ہوگی۔ ایسی مہربان غریب پرور اور ہردلعزیز رانی پانے سے ہر خاص و عام خوش ہے۔

کیرتن کے بعد گیان سنگھ اندرا کے پاس جاتا ہے۔ اور کہتا ہے "اندرا! کیا ابھی تمہارا امتحان پورا نہیں ہوا؟"

اندرا کہتی ہے "ابھی نہیں۔ مجھے اس رتبہ کے قابل بننے دیجئے۔"

راجکمار "اس تقریب کی یادگار میں .... محبت کا کوئی تحفہ پیش کرتا ہوں۔"

اندرا "محبت کا کوئی تحفہ ابھی میرے لئے منع ہے۔"

راجکمار "تم بڑی بے رحم ہو اندرا!"

اندرا "اور ایسی بے رحم عورت کو آپ رانی بنانا چاہتے ہیں۔ رانی کو

رحم دل ہونا چاہیئے۔"

راجکمار۔"ساری دنیا کے لئے تو تم رحم کی دیوی ہو میرے لئے پتھر کی مورت۔"

گیان سنگھ اب اندرا کے ہاتھوں میں ہے۔روح وہ ہے جسم گیان سنگھ، اندرا کو رعایا کے حقوق کا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھولتا۔آئے دن نئے نئے فرمان جاری ہوتے ہیں۔جن میں رعایا کی ضرورتوں کے لئے کوئی نہ کوئی نیا حق عطا کیا جاتا ہے۔شاہی اخراجات کم کئے جاتے ہیں۔شاہی محل میں بھی وہ نفاست اور شوکت نہیں ہے۔خادموں کی ایک پوری فوج تھی۔ انہیں جواب دے دیا جاتا ہے۔حسین لونڈیوں کا بھی ایک قافلہ تھا۔انہیں بھی جواب مل جاتا ہے۔محلات کے کئی حصے رعایا کی ضرورتوں کے لئے علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں۔ایک محل میں کتب خانہ کھل جاتا ہے دوسرے میں شفاخانہ۔ایک پوری عمارت کسانوں اور مزدوروں کے لئے وقف کر دی جاتی ہے۔جہاں اُن کی پنچائتیں ہوتی ہیں۔اور طرح طرح کے زرعی آلات کی نمائش کی جاتی ہے۔فوج کے ایک بڑے حصے کو موقوف کر دیا جاتا ہے۔اُس کی جگہ رعایا میں سے نوجوان چن لئے جاتے ہیں۔اور قومی فوج آراستہ کی جاتی ہے۔نوجوانوں کے لئے ورزش گاہیں تعمیر کی جاتی ہیں گیان سنگھ ملوکیت کی آب وہوا میں پلا ہوا شہزادہ ہے۔اس کا حکم رعایا کے لئے قانون ہو سکتا تھا۔اب وہ قدم قدم پر اپنے اوپر بندشیں عاید کرتا ہے۔یہ سب اندرا کی تحریک کا اثر ہے۔اندرا جو فرمان لکھتی ہے اس پر وہ آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیتا ہے۔

اِدھر اُمراء اور اراکین دربار کے حلقہ میں بڑی تشویش پھیلتی ہے۔اُن کے خیال میں ریاست تباہ ہوئی جاتی ہے۔گیان سنگھ کی یہی حالت

رہی تو تھوڑے دنوں میں اُمراء کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حریت کے اس سیلاب کو روکنے کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ پدما اس سازش کی روح رواں ہے۔ یہ لوگ تخفیف شدہ فوج کے سپاہیوں اور برخاست شدہ شاہی ملازموں میں بدگمانیاں پھیلاتے ہیں۔ اُمراء میں بھی شورش پیدا کرتے ہیں۔ گیان سنگھ کو بزور شمشیر زیر کر کے کسی دوسرے راجہ کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ پدما کا اس سازش سے صرف یہی منشا ہے کہ اندرا ذلیل اور بدنام ہو۔ وہ اس کو بدنام کرتی ہے۔ اور ان سارے تغیرات کا واحد سبب اندرا ہی کو ٹھہراتی ہے۔ اس لئے باغیوں کی یہ جماعت اُس کی جان کی دشمن ہو جاتی ہے۔ مسلح شورش کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

گیان سنگھ اور اندرا شاہی محل کے ایک مختصر سے کمرہ میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ کمرہ میں کوئی تکلف یا آرائش نہیں ہے۔ اندرا نے آج یہ بازی لگائی ہے کہ اگر وہ جیت جائے گی تو راجہ سے جو چاہے گی۔ طلب کرے گی۔ راجہ کو اس کی تعمیل میں انکار نہ ہوگا۔ راجہ کو بھی یہی اختیار ہوگا۔ دونوں اپنے اپنے خیال میں خوش ہیں۔ گیان سنگھ کی خوشی کا وارا پارا نہیں ہے۔ وہ آج اپنی کامیابی کے یقین سے پھولا نہیں سماتا۔ دونوں خوب دل لگا کر کھیل رہے ہیں۔ پہلے راجہ صاحب غالب آتے ہیں۔ اور اندرا کے کئی مہرے پیٹ لیتے ہیں۔ اُن کی مسرت ہر لحہ بڑھتی جاتی ہے۔ دفعتاً بازی پلٹ جاتی ہے۔ راجہ کے بادشاہ پر شہ پڑ جاتی ہے۔ اور اس کا فرزین پٹ جاتا ہے۔ پھر تو ایک ایک کر کے اُس کے سبھی مہرے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ہار جاتا ہے۔ اُس کے چہرہ پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ اندرا اُسی وقت ایک فرمان نکالتی ہے۔ اور راجہ سے اس پر دستخط کرنے

کی استدعا کرتی ہے۔ راجہ دبی ہوئی نظروں سے فرمان کو دیکھتا ہے۔ غلّہ کا محصول درآمد معاف کر دیا گیا ہے۔ جس سے شاہی محاصل میں ایک معتدبہ رقم کی کمی ہو جاتی ہے۔ ریاست میں غلّہ بہت کم ہوتا ہے۔ غلّہ زیادہ تر دیگر ملکوں سے آتا ہے۔ اس پر درآمد محصول کے باعث غلّہ گراں ہو جاتا تھا اور رعایا کو تکلیف ہوتی تھی۔ اندرا ہمیشہ رعایا کو ارزاں غلّہ بہم پہنچانے کی فکر میں تھی۔ اور آج موقعہ پا کر اس نے یہ فرمان پیش کیا۔ گیان سنگھ کو تامل تو ہوتا ہے۔ مگر زبان ہار چکا ہے۔ فرمان پر دستخط کر دیتا ہے۔

اُس وقت باہر ایک شور برپا ہوتا ہے۔ ایک سنتری دوڑا ہوا آتا ہے۔ اور اطلاع دیتا ہے۔ باغیوں نے شاہی محل کو گھیر لیا ہے۔ اور اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۱۳)

گیان سنگھ کا چہرہ غصّہ سے سرخ ہو جاتا ہے۔ وہ فوراً اسلحہ سے آراستہ ہو کر اندرا سے رخصت ہوتا ہے۔ اور فصیل کے اوپر چڑھ کر بلند آواز میں شورش کرنے والوں کو مخاطب کر کے اس شورش کا سبب پوچھتا ہے۔

ایک آدمی نیچے سے جواب دیتا ہے "ہم یہ مظالم برداشت نہیں کر سکتے۔ اندرا ہماری تباہی کا باعث ہے۔ وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی"

گیان سنگھ اندرا کے احسانات جو اس نے قوم پر کیے ہیں۔ بیان کرتا ہے۔ مگر نیچے سے وہی جواب آتا ہے۔ "اندرا ہماری تباہی کا باعث ہے۔ وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی" گویا کوئی گراموفون کی صدا ہو۔

گیان سنگھ تب وہ فرمان نکال کر پڑھنا شروع کرتا ہے۔ جس پر اُس نے دستخط کیا ہے۔ مگر اس کا بھی باغیوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پھر

وہی رٹ لگائی جاتی ہے "اندرا ہماری رانی نہیں بن سکتی وہ ہماری تباہی کا باعث ہے۔" اس کے ساتھ ہی باغی لوگ زینوں سے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صدر دروازہ بند کردیا جاتا ہے۔

گیان سنگھ اب غضبناک ہو کر دھمکیاں دیتا ہے۔ مگر اس کی فہمائش کی طرح دھمکیاں بھی مجمع پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ وہ برابر فصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

گیان سنگھ طیش میں آکر خطرے کے گھنٹے پاس جاتا ہے۔ اور اُسے زور سے بجاتا ہے۔ فوج کے سپاہی سنتے ہیں مگر نکلتے نہیں۔ دوسری بار گھنٹہ بجتا ہے، سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ اور جلدی جلدی اسلحہ جمع کرنے لگتے ہیں۔ تیسرا گھنٹہ ہوتا ہے۔ سب فوج نکل پڑتی ہے۔ اسی وقت پدما آکر اُنہیں بہکاتی ہے "نادانو! کیوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارتے ہو۔ کیا اب تک تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں۔ تمہارے کتنے ہی بھائی علیحدہ کردیئے گئے۔ اور آج در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ تم لوگوں کی باری بھی بہت جلد آئی جاتی ہے۔ اور یہی لیل و نہار ہیں تو دو چار مہینے میں سب کے سب نکال دیئے جاؤ گے۔ یہ باغی کون ہیں۔ یہ وہی تمہارے بھائی ہیں۔ جنہیں گیان سنگھ کی نئی بن بیاہی رانی اندرا نے نکال دیا ہے۔ ایک بازاری طوائف تمہارے اوپر اس طرح حکومت کررہی ہے۔ کیا تم لوگ اسے برداشت کرسکتے ہو۔"

اس تقریر کا یہ اثر ہوتا ہے۔ کہ سپاہی واپس چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے اسلحے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

اُس وقت پدما اندرا کے پاس آکر دوستانہ مشورہ دیتی ہے "اندرا! بھاگ جاؤ ورنہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔" اندرا اس موقع کو غنیمت

سمجھتی ہے اور پدما کا احسان مانتی ہے۔ پدما اُسے ایک چور دروازہ سے لے جاتی ہے جو شہر کے باہر ایک مندر میں کُھلتا ہے۔ ایسے ہی نازک موقعوں کے لئے وہ سُرنگ بنائی گئی ہے۔ پدما نے ہری ہر کو پہلے ہی بلا لیا ہے۔ اُس کے ساتھ دو گھوڑے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔

ہری ہر ایک گھوڑے پر اندرا کو سوار کراتا ہے۔ دوسرے پر خود بیٹھتا ہے اور دونوں شہر کی اندھیری سڑکوں پر ہوتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

اسی وقت پدما فصیل پر آ کر گیان سنگھ کی بغل میں کھڑی ہو کر کہتی ہے۔ "بہادرو! میں تمہیں مژدہ سناتی ہوں۔ کہ اندرا اب اس محل میں نہیں ہے تم میں سے کوئی ایک معتبر آدمی قصرِ شاہی میں آ کر اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔ وہ جس گمنامی سے نکلی تھی۔ اُسی میں پھر چلی گئی ہے۔ اب تم لوگ واپس جاؤ۔ میں تم لوگوں کو اطمینان دلاتی ہوں کہ تم لوگوں کے سر سے یہ احکام ہٹائے جائیں گے"

گیان سنگھ زخم خوردہ طائر کی طرح ایک ٹھنڈی سانس لے کر گر پڑتا ہے۔ باغیوں کی جماعت لوٹ جاتی ہے۔ اور گیان سنگھ کو اس شورش سے نجات دلانے کی نیکنامی پدما کو ملتی ہے۔

گیان سنگھ مایوسانہ لہجہ میں پوچھتا ہے۔" اندرا کہاں چلی گئی؟"

پدما۔"جہاں سے آئی تھی وہیں چلی گئی۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اُسے تم سے محبت تھی تو تم غلطی پر ہو۔ وہ یہاں بدرجہ مجبوری پڑی ہوئی تھی۔ اُس کا عاشق وہی بدنصیب شاعر ہری ہر ہے۔ اُسی پر وہ جان دیتی ہے۔ اس کو کوئی منصب دلانے کی فکر میں وہ یہاں پڑی ہوئی تھی۔ جب اُس نے دیکھا۔ کہ یہاں خطرہ ہے تو بھاگ نکلی۔ بے وفا تھی!"

گیان سنگھ نیم جانی کی حالت میں اندر آتا اور اسی غیظ میں اندرا کی ہر ایک چیز کو پیروں سے کچل ڈالتا ہے عشق ناکام ہو کر حسرت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اندرا کی کئی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی ہیں۔ گیان سنگھ اُن تصاویر کو اُتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ پدما اس وقت تحمل اور عفو کی دیوی بنی ہوئی ظاہر ہیں اُس کے غصہ کو فرو کر رہی ہے۔ مگر باتیں ایسی ایسی چوٹ کرنے والی کہتی ہے کہ گیان سنگھ کی آتش حسد اور بھی مشتعل ہو جاتی ہے۔ وہ اُس طنبورے کے سینکڑوں ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ دفعتاً اُسے ایک بات یاد آجاتی ہے۔ وہ فوراً باہر آتا ہے۔ اور کئی معتبر سپاہیوں کو اندرا کا تعاقب کرنے کے لئے روانہ کر دیتا ہے۔ اور حکم دیتا ہے کہ شہر کے سب ناکے بند کر دیئے جائیں۔

پھر اندر جا کر اندرا کی پوجا کی چیزیں اور ٹھاکر جی کا سنگھاسن سب اٹھا اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ جو کنیزیں اندرا کی خدمت پر مامور تھیں انہیں نکال دیتا ہے۔ اور ایک جنون کے عالم میں پیر ٹپکتا ہوا بار بار اندرا کو کوستا ہے۔ "مکارہ۔ عیارہ۔ ساحرہ۔ بے وفا۔ دغا شعار"

پدما ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا کر اُسے دیتی ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں اُسے خالی کر کے گلاس کو ٹپک دیتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ نتھنے پھڑک رہے ہیں۔ پدما اُسے پنکھا جھلنے لگتی ہے۔ ان دلجوئیوں سے راجہ کا دل پدما کی طرف سے نرم ہو جاتا ہے۔ وہ اُسے ضبط اور وفا کی دیوی خیال کرنے لگتا ہے۔ احسان مندی کا احساس بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پدما اگر آڑے نہ آتی تو باغیوں نے محل پر قبضہ کر لیا ہوتا۔ اور معلوم نہیں اس کے سر پر کیا آفت آتی۔ وہ اُس سے اپنی گزشتہ فروگذاشتوں

کی معافی مانگتا ہے۔ اور پہلی بار اُس کی محبت کا جلوہ اس کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس مایوسی اور غم کی حالت میں پدما ہی اُسے نجات کی دیوی نظر آتی ہے۔ وہ اُسے گلے سے لگا لیتا ہے۔ پدما فرطِ محبت سے اُس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے۔

(۱۴)

اندرا اور ہری ہر گھوڑوں پر سوار شہر پناہ کے ایک دروازے پر پہنچتے ہیں۔ دروازہ بند ہے۔ دوسرے دروازے پر آتے ہیں۔ وہ بھی بند ہے ہری ہر کو معلوم ہے کہ فصیل میں ایک شگاف ہے اُس پر گھاس پھوس جمی ہوتی ہے۔ اور کسی کو شاید اس شگاف کی خبر بھی نہ ہو۔ دونوں اسی شگاف کے اندر گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور کانٹوں سے اُلجھتے گھاس پھوس کے ڈھیروں کو ہٹاتے بمشکل شگاف کو پار کرتے ہیں۔ مگر باہر کی طرف شہر پناہ سے ملی ہوئی ندی آتی ہے۔ مجبوراً دونوں ندی میں گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور تیرتے ہوئے ندی کے پار ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب پہنچ کر دونوں ذرا دم لیتے ہیں۔ اور تب پھر بھاگتے ہیں۔ بہت دُور چلنے کے بعد انہیں ایک مندر ملتا ہے۔ دونوں وہیں گھوڑے کھول دیتے ہیں اور رات بسر کرتے ہیں۔ صبح کو دونوں وہاں سے پیادہ پا روانہ ہوتے ہیں۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے ایک بڑے گاؤں میں پہنچتے ہیں۔ وہاں گاؤں کا زمیندار برات لے کر اپنی شادی کرنے جا رہا ہے۔ ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ دوسرے موضعوں کے لوگ بھی تماشا دیکھنے آئے ہیں۔ برات چلنے کو تیار ہے۔ دولھا گھر سے نکل کر موٹر پر بیٹھتا ہے۔ اور موٹر چلنا چاہتی ہے کہ ایک عورت آکر موٹر کے سامنے لیٹ جاتی ہے۔ یہ زمیندار صاحب کی پہلی بیوی

ہے۔ جسے اُنہوں نے پندرہ سال سے چھوڑ رکھا ہے۔ آج وہ اپنی شادی کرنے جاتے ہیں۔ تو بیوی اُن کے راستہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ میاں بیوی میں سخت کلامیوں کی نوبت آتی ہے۔ شوہر بیوی کو دھکا کر راستہ سے ہٹ جانے کا حکم دیتا ہے۔ بیوی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ غصّہ میں آکر موٹر چلا دیتا ہے۔ عورت کچلی جاتی ہے۔ اس وقت ہزاروں آدمی غضبناک ہو کر زمیندار صاحب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور اُسے مار ڈالتے ہیں۔ اندرا اور ہری ہر افسوس کرتے ہیں۔ کہ اور پہلے یہاں نہ پہنچے۔ ورنہ شاید سمجھا بجھا کر دونوں میں میل کرا دیتے۔ ذرا دیر اس گاؤں میں ٹھہر کر دونوں پھر آگے بڑھتے ہیں۔ جہاں ناچ ہو رہا ہے۔ اندرا وہاں گاتی ہے۔ اور اُنہیں لوگوں کے ساتھ رات بسر کرتی ہے۔

کئی دن کے بعد دونوں اس ریاست کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں اور سانگلی کی ریاست میں پہنچتے ہیں۔ یہیں دونوں ایک گاؤں میں رہنے لگتے ہیں۔ دونوں گاؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اُن کی خدمت سے گاؤں والے خوش ہیں۔

گاؤں میں ایک ٹھاکر دوارہ ہے۔ وہیں دونوں رات کو کیرتن کرتے ہیں۔ اُن کی خدمت اور بھگتی کا شہرہ قرب وجوار کے مواضعات میں پھیل جاتا ہے۔ اور عقیدتمندوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ اُن دہقانوں کی نگاہ میں یہ دونوں آسمانی وجود ہیں اور وہ اُن کی دل وجان سے پرستش کرتے ہیں۔ نغمہ وشعر کی اس دُنیا میں دونوں حقیقی وجود کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ اور دنیاوی کدورتیں اور خواہشیں اُن کے دلوں سے نکل جاتی ہیں۔ انہیں ہر ایک وجود میں ایک ہی حقیقت کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہری ہر کبھی کبھی

آبشار کے کنارے جا نکلتا ہے۔ اور اُس کے نغمہ میں حقیقت کی آواز سنتا ہے۔ اور روحانیت کے جذبات سے اس کا دل لبریز ہو جاتا ہے کبھی کسی جنگلی پھول کو دیکھ کر وہ وجد میں آ جاتا ہے۔ اور اُس میں معبود کا جلوہ دیکھتا ہے۔

ایک دن سانگلی کے کنور صاحب شکار کھیلنے آتے ہیں۔ ان کے ہمراہی برقنداز اور شکاری وغیرہ خیمے لے کر آ پہنچتے ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ کنور صاحب اپنے ہاتھی پر گاؤں میں آتے ہیں۔ اور شکار کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ اُسی وقت اندرا اُن کے روبرو جا کر ایک معرفت کا پد گاتی ہے۔ کنور صاحب کے دل میں لڑکی کی محبت تازہ ہو جاتی ہے۔ پہلی ہی بار جب انہوں نے اندرا کو دیکھا تھا۔ اُسے پہچان گئے تھے۔ لیکن اس حالت میں اپنی لڑکی کو تسلیم کرنے کی انہیں ہمت نہ ہوتی تھی۔ تب سے برابر انہیں اپنی پیاری بیٹی کی یاد بے چین کرتی رہتی تھی۔ لیکن اس دوران میں اُن کی محبت اُن خیالات پر غالب آ چکی ہے۔ وہ اب ضبط نہیں کر سکتے۔ اور اندرا کو سینے سے لگا کر کہتے ہیں۔ "تو میری کھوئی ہوئی پیاری بیٹی ہے" وہ اُسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ مگر ہری ہر ثروت اور تموّل کے جال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اُسے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ثروت میں اندرا کو نہ کھو بیٹھے۔ اندرا سے وہ کچھ نہیں کہتا۔ مگر اُس کے بشرہ سے اُس کے دل کی کیفیت عیاں ہو جاتی ہے۔ اور اندرا اپنے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کرتی ہے۔ مندر کے سامنے جھونپڑی میں دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ گھر میں کوئی سامان نہیں۔ اُدھر شاہی محل میں ثروت ہے۔ جاہ و حشم ہے۔ مگر اندرا یہ سب کچھ محبت پر نثار کر دیتی ہے۔

(۱۵)

اندرا کو محل سے نکال کر اور اُس کی طرف سے بے فکر ہو کر، پدما کی طبعی شرافت جو کچھ دنوں حسد کے باعث پس پردہ ہو گئی تھی۔ نمودار ہو جاتی ہے، اور وہ دل و جان سے گیان سنگھ کی خدمت کرتی ہے۔ اس یاس و غم کی حالت میں اگر وہ کچھ کھاتا ہے۔ تو اُسی کے اصرار سے۔ سیر کرنے جاتا ہے تو اُسی کے کہنے سے۔ ریاست کے کاروبار دیکھتا ہے۔ تو اُسی کے ایما سے۔ وہ کبھی گیت گا کر کبھی افسانے سُنا کر اُس کا دل بہلاتی ہے۔ لیکن اکثر راتوں کو راجہ کی نیند کھل جاتی ہے۔ اور اندرا کو یاد کر کے بیتاب ہو جاتا ہے۔ تب حسد کی آگ اس کے سینہ میں مشتعل ہو جاتی ہے۔ اندرا کسی غیر کی ہو کر رہے، یہ اُس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ تپسونی بن کر رہتی تو غالباً وہ اُس کے قدموں کی خاک ماتھے پر لگاتا مگر وہ کسی غیر کے پہلو میں ہے۔ یہ خیال کر کے اُس کے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔

گیان سنگھ کے مخبر اور جاسوس چاروں طرف چھوٹے ہوئے ہیں۔ ایک دن اُسے خبر ملتی ہے کہ اندرا سانگلی کے ایک موضع میں ہے۔ گیان سنگھ اسی وقت چند آزمودہ سپاہیوں اور جان نثار رفیقوں کو لے کر اندرا اور ہری ہر کی تلاش میں چل کھڑا ہوتا ہے۔ پدما اُسے روکتی ہے۔ منتیں کرتی ہے۔ مگر وہ مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ آخر مجبور ہو کر وہ بھی اُس کے ساتھ چل کھڑی ہوتی ہے۔ بیس آدمی گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اور ڈبل چال چل رہے ہیں۔ دشوار گذار پہاڑی راستہ ہے۔ گیان سنگھ اور پدما ہمراہیوں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ دفعتاً کئی مسلح ڈاکوؤں سے ان کا سامنا ہو جاتا ہے۔ پدما اپنے پستول سے دو آدمیوں کو واصل جہنم کر دیتی ہے۔ باقی ڈاکو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ کئی دن کے بعد یہ جماعت اُس موضع میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اندرا اور ہری ہر

اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

دم کے دم خبر پھیل جاتی ہے کہ راجہ گیان سنگھ اندرا اور ہری ہر کو گرفتار کرنے چڑھے آتے ہیں۔ قرب و جوار کے دہقانی لاٹھیوں، اور گنڈاسے اور کلہاڑے لے کر آتے ہیں۔ اندرا اور ہری ہر دونوں جماعتوں کے بیچ میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی گیان سنگھ تلوار کھینچ کر اُن پر جھپٹتا ہے۔ اندرا اور ہری ہر دونوں سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پرماتما کا دھیان کرنے لگتے ہیں۔ قریب ہے کہ تلوار ہری ہر کی گردن پر پڑے کہ پدما آجاتی ہے اور ایک کر راجہ کے ہاتھ سے تلوار چھین لیتی ہے۔ دونوں محبت کے شیدائیوں کی یہ جان بازی اور بے نفسی دیکھ کر گیان سنگھ کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اُس کے دل میں دفعتاً اس روشنی کا ظہور ہوتا ہے جس کے سامنے کمزوریاں اور نفس کی سرکشیاں مٹ جاتی ہیں۔ وہ ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر اندرا کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ پدما اُسے ایک ایسے فعل سے باز رکھ کر جو راجہ صاحب کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیتا۔ اُن کے دل پر فتح پا جاتی ہے۔

گیان سنگھ ایک لمحہ میں اندرا کے قدموں سے اُٹھ کر پدما کو گلے لگا لیتا ہے۔ اندرا بھی پدما کو سینہ سے لگا لیتی ہے۔ پھر ہری ہر اور گیان سنگھ بغلگیر ہوتے ہیں۔

طلوعِ محبّت

بھونڈو پسینہ میں شرابور لکڑی کا ایک گٹھا سر پہ لئے آیا۔ اور اسے زمین پر پٹک، کر بنٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گویا زبانِ حال سے پوچھ رہا تھا "کیا ابھی تک تیرا مزاج درست نہیں ہُوا؟"

شام ہو گئی تھی۔ پھر بھی لو چلتی تھی۔ اور آسمان پر گرد و غبار چھایا ہُوا تھا۔ ساری قدرت دق کے مریض کی طرح نیم جان ہو رہی تھی۔ بھونڈو صبح گھر سے نکلا تھا۔ رخت کے سایہ تلے بسر کی تھی۔ سمجھا تھا۔ اس تپسیا سے دیوی ی کا منہ سیدھا ہو گیا ہوگا۔ لیکن آ کر دیکھا تو وہ ابھی تک تنی بیٹھی تھی۔

بھونڈو نے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا "لا ایک پانی کا لوٹا دے دے۔ بڑی پیاس لگی ہے۔ مر گیا سارے دن میں بجار جاؤں گا تو تین آنے سے بیشی نہ ملیں گے۔"

بنٹی نے سرکی کے اندر بیٹھے بیٹھے کہا "دھرم بھی لوٹو گے اور پیسے بھی۔ منہ دھو رکھو۔"

بھونڈو نے بھویں سکوڑ کر جواب دیا "کیا دھرم دھرم بکتی ہے۔ دھرم کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ دھرم وہ کرتا ہے جس پر بھگوان کی مہربانی ہو۔ ہم دھرم کماک کریں گے۔ پیٹ بھرنے کو جینا چینا تو ملتا نہیں۔ دھرم کیا کریں گے۔"

بنٹی نے اپنا وار اوچھا پڑتے دیکھ کر چوٹ پر چوٹ کی "دنیا میں کچھ ایسے دھرماتما بھی ہیں جو اپنا پیٹ چاہے نہ بھر سکیں۔ مگر پڑوسیوں کی دعوت کرتے پھرتے ہیں۔ ورنہ سارے دن بن بن کی لکڑیاں نہ کاٹتے پھرتے۔ ایسے دھرماتما لوگوں کو جورو رکھنے کی کیوں سوجھتی ہے۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دھرم جھگڑا کیا اکیلے نہیں چلتا۔"

بھوندو اس چوٹ سے تلملا اٹھا۔ اس کی رگیں تن گئیں۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بنٹی کا منہ وہ ایک ڈپٹ میں بند کر سکتا تھا۔ مگر اس نے یہ نہ سیکھا تھا۔ جس کی طاقت کی سارے کنجڑوں پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جو تن تنہا سو بچاس جوانوں کا نشہ اتار سکتا تھا۔ وہ ایک کمزور عورت کے سامنے منہ نہ کھول سکا۔ دبی زبان سے بولا "جورو دھرم گنوانے کے لئے نہیں لائی جاتی۔ دھرم کمانے کے لئے لائی جاتی ہے۔"

یہ دونوں کنجڑ خاوند بیوی تین دن سے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ اس باغ میں اترے ہوئے تھے۔ سارے باغ میں سرکیاں ہی سرکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان تین ہاتھ چوڑی اور چار ہاتھ لمبی سرکیوں کے اندر ایک گھرانہ زندگی کی تمام مصروفیتوں، تمام بے نوائیوں کے ساتھ گزر اوقات کر رہا تھا۔ ایک طرف چکی تھی۔ ایک طرف باورچی خانہ کی اشیاء۔ ایک طرف اناج کے مٹکے۔ دروازہ پر ایک کھٹولی، بچوں کے لئے پڑی تھی۔ ہر ایک گھر کے ساتھ دو دو بھینسے یا گدھے تھے۔ جب ڈیرا کوچ ہوتا تھا۔ تو سارا ساز و سامان ان گدھوں یا بھینسوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ یہی ان کنجڑوں کی زندگی تھی۔ ساری بستی ایک ساتھ چلتی تھی، ایک ساتھ ٹھہرتی تھی۔ ان کی دنیا اسی بستی کے اندر تھی۔ آپس ہی میں شادی۔ بیاہ۔ لین دین۔ جھگڑے قضیئے ہوتے رہتے تھے۔

اس دنیا کے باہر سارا جہان اُن کے لیئے شکار گاہ تھا۔ ان کے کسی علاقہ میں پہنچتے ہی وہاں کی پولیس آکر انہیں نگرانی میں لے لیتی تھی۔ پڑاؤ کے ارد گرد چوکیداروں کا پہرہ لگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے تو پولیس کے آدمی ان کے ساتھ ہو لیتے۔ رات کو اُن کی حاضری لی جاتی۔ پھر بھی گرد و نواح کے لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کیونکہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے اٹھا لیتے۔ اور اُن کے ہاتھ میں جا کر کوئی شئے لوٹ نہ سکتی تھی۔ رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے۔ چوکیدار اُن سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ خونخوار تھے۔ ذراسی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے سختی کرنے میں جان کا خطرہ تھا۔ کیونکہ کنجڑ لوگ بھی ایک حد تک ہی پولیس کا دباؤ مانتے ہیں۔ ساری بستی میں بھونڈو ہی ایک ایسا شخص تھا۔ جو اپنی محنت کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر اس لیئے نہیں کہ وہ پولیس والوں سے خائف تھا۔ بلکہ اس لیئے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی۔ کہ وہ ناجائز طریقہ سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

بنٹی کو شوہر کی یہ پاکدامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کی بہنیں نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور پہنتیں تو بنٹی اپنے شوہر کی بزدلی پہ کڑھتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہو چکے تھے۔ لیکن بھونڈو اپنی عاقبت بگاڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ آج بھی صبح یہی سوال درپیش تھا۔ اور بھونڈو لکڑی کاٹنے جنگل نکل گیا تھا۔ کچھ مل جاتا۔ تو بنٹی کی اشتک شوئی ہو جاتی مگر آج سوائے لکڑی کے اور کوئی شئے نہ ملی نہ کوئی جانور نہ خس نہ جڑی بوٹی۔

بنٹی نے کہا "جن سے کچھ نہیں ہو سکتا، وہی دھرماتما بن جاتے ہیں۔ رانڈا اپنے ماندھ ہی میں خوش ہے"

بھوندو نے پوچھا "تو میں کھٹو ہوں"

بنٹی نے اس سوال کا سیدھا جواب نہ دیا۔ "میں کیا جانوں۔ تم کیا ہو۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں۔ سب کھاتی ہیں۔ ہنستی کھیلتی ہیں۔ پہنتی اوڑھتی ہیں۔ کیا میرے ہی دل نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ بیاہ کرکے جندگی کھراب ہو گئی۔"

بھوندو نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ "وہ جانتی ہے۔ پکڑا گیا تو تین سال سے کم کی سجا نہ ہوگی۔"

بنٹی پر اثر نہ ہوا۔ بولی "جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے۔ تو تم ہی کیوں پکڑے جاؤ گے۔"

بھوندو "اور لوگ پولیس کی کھوشامدیں کرتے ہیں۔ چوکیداروں کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ تو جانتی ہے میں بھی یہ کرم کروں۔"

بنٹی نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بولی "میں تمہارے ساتھ ستی ہونے نہیں آئی۔ پھر تمہارے چھرے گنڈاسے سے کوئی کہاں تک ڈرے۔ جانور کو بھی جب تھان پر چارہ نہیں ملتا تو رسا تڑا کر کسی کھیت میں جا گھستا ہے۔ میں تو آدمی ہوں۔"

بھوندو نے اس کا جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کوئی دوسرا گھر کر لے گی۔ یہ خیال بھی اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ آج بنٹی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی دی۔ اب تک بھوندو اس طرف سے بے فکر تھا۔ اب یہ نیا خطرہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا روز سیاہ کبھی نہ آنے دیگا۔ وہ اس کے لئے سب کچھ کر گزرے گا۔ بھوندو کی نگاہوں میں بنٹی کی

وہ عزت نہیں رہی وہ اعتماد نہیں رہا۔ مضبوط دیوار کو ٹکاوٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب دیوار ہلنے لگتی ہے۔ تو ہمیں اُس کے سنبھالنے کی فکر ہوتی ہے۔ آج بھونڈو کو اپنے گھر کی دیوار ہلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ آج تک بنٹی اس کی اپنی تھی۔ وہ جس طرح اپنی طرف سے بے پروا تھا۔ اس کی طرف سے بے فکر۔ وہ جس طرح خود رہتا تھا۔ اُسی طرح اس کو رکھتا تھا۔ جو خود کھاتا تھا وہی اُسے کھلاتا تھا۔ اُس کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ پر آج اُسے معلوم ہوا کہ وہ اُس کی اپنی نہیں ہے۔ اب اُسے اس کی خاص طور پر دل جوئی کرنا ہوگی۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کا گدھا چر کر چپ چاپ سر جھکائے چلا آرہا ہے۔ بھونڈو نے کبھی اس کے کھانے پینے کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ آج بھونڈو نے باہر آکر اُسے پچکارا۔ اس کی پیٹھ سہلائی اور اُسے پانی پلانے کے لئے ڈول اور رسی لے کر کنوئیں پر چلا گیا۔

—————— (۲) ——————

اُس کے دوسرے ہی دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہوگئی۔ اس رات بھونڈو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ بنٹی نے چوکیدار سے کہا۔ کل جنگل سے نہیں لوٹا۔ صبح کے وقت بھونڈو آپہنچا۔ اس کی کمر میں روپوں کی ایک تھیلی تھی۔ کچھ سونے کے گہنے تھے۔ بنٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دیئے۔ روپوں کی کیا پہچان ہو سکتی تھی۔

بھونڈو نے پوچھا۔ اگر کوئی پوچھے۔ اتنے سارے پیسے کہاں سے ملے تو کیا کہو گی؟

بنٹی نے آنکھیں نچا کر کہا "کہہ دوں گی۔ کیوں بتاؤں دنیا کماتی ہے۔ تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے۔ ہم اپنا حساب کیوں دیں؟"

بھوندو نے گردن ہلا کر کہا "یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا۔ بنٹی! تو کہہ دینا میں کئی مہینے سے تین تین چار چار روپے مہینہ بچاتی رہی ہوں۔ ہمارا خرچ ہی کون بڑا لمبا ہے۔"

دونوں نے مل کر کئی جواب سوچ لئے۔ جڑی بوٹیاں بیچتے ہیں۔ ایک ایک جڑی کے لئے کئی کئی روپے مل جاتے ہیں۔ کھس۔ گھاس، جانوروں کی کھالیں سب بیچتے ہیں۔

اس طرف سے بے فکر ہو کر دونوں بازار چلے۔ بنٹی نے اپنے لئے کئی قسم کے کپڑے، چوڑیاں۔ مہندے۔ سیندور، پان، تمباکو، تیل، اور مٹھائی لی۔ پھر دونوں شراب کی دکان پر گئے۔ خوب شراب پی، اور دو بوتلیں رات کے لئے لے کر گھومتے پھرتے گاتے بجاتے گھڑی رات گئے ڈیرہ پر آئے۔ بنٹی کے پاؤں آج زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنے کے ساتھ ہی بن ٹھن کر پڑوسنوں کو اپنی چھب دکھانے چلی گئی۔

جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئی اور کھانا پکانے لگی۔ تو پڑوسنوں نے تنقید کرنی شروع کر دی "کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے۔"

"بڑا دھرماتما بنا پھرتا ہے۔"

"بگلا بھگت ہے۔"

"بنٹی تو جیسے آج ہوا میں اڑ رہی ہے۔"

"آج بھوندو کی خاطر ہو رہی ہے۔ ورنہ کبھی ایک لٹیا پانی دینے بھی نہ اٹھتی تھی۔"

اُس رات بھوندو کو دیوی کی یاد آئی۔ آج تک اُس نے کبھی دیوی کو بلیدان نہ دیا تھا۔ پولیس کو گانٹھنا کسی قدر مشکل تھا۔ کچھ خودداری بھی کھونی پڑتی تھی۔ دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہو جائے گی۔ ہاں اُس سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی۔ اُس کی برادری کے اور لوگ عام طور پر کوئی کام کرنے سے پہلے قربانی کرتے تھے۔ بھوندو نے یہ خطرہ نہ لیا۔ جب تک مال ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس میں سے دیوتاؤں کو کھلا دینا حماقت نہیں، تو اور کیا ہے۔ لوگوں سے اپنی چوری پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے کسی کو خبر نہ دی۔ یہاں تک کہ نبٹی سے بھی نہ کہا اور بکرے کی تلاش میں گھر سے نکلا۔

نبٹی نے پوچھا "اب کھانے کے بکھت کہاں چلے؟"

"ابھی آتا ہوں"

"مت جاؤ مجھے ڈر لگتا ہے"

بھوندو نے محبت کے اس نئے اظہار پر خوش ہو کر کہا "مجھے دیر نہ لگیگی۔ تو یہ گنڈاسا اپنے پاس رکھ لے"

اُس نے گنڈاسا نکال کر نبٹی کے پاس رکھ دیا۔ اور باہر نکلا۔ مگر بکرا کہاں ملے۔ آخر اس مشکل کو بھی اُس نے ایک خاص طریقہ سے حل کیا۔ قریب کی بستی میں ایک گڈریے کے پاس کئی بکرے تھے۔ اُس نے سوچا کہ وہیں سے ایک بکرا اٹھا لاؤں۔ دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے۔ یا اس سے کہ بکرا کہاں سے آیا اور کیوں آیا۔

لیکن بستی کے قریب پہنچا ہی تھا۔ کہ پولیس کے چاروں آدمیوں نے اُسے گرفتار کر لیا۔ اور مشکیں باندھ کر تھانے لے چلے۔

(۳۳)

بنٹی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی۔ آج اُسے اپنی زندگی گلزار معلوم ہوتی تھی۔ مسرت سے کھلی جاتی تھی۔ آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اُس کے سر میں خوشبودار تیل پڑا۔ اس کا آئینہ خراب ہو گیا تھا۔ اس میں اب منہ دکھائی بھی نہ دیتا تھا۔ آج وہ نیا آئینہ لائی تھی۔ اُس کے سامنے بیٹھ کر اُس نے بال سنوارے منہ پر اُبٹن ملا۔ صابن لانا وہ بھول گئی تھی۔ صاحب لوگ صابن لگانے ہی سے تو اتنے گورے ہو جاتے ہیں۔ صابن ہوتا۔ تو اُس کا رنگ بھی کچھ نکھر آتا ایک ہی دن میں بالکل گوری تو نہ ہو جاتی۔ لیکن رنگ ایسا سیاہ بھی نہ رہتا۔ کل وہ صابن کی ٹکیاں ضرور خرید لائے گی۔ اور روز اس سے منہ دھوئے گی بال سنوار کر اُس نے ماتھے پر السی کا لعاب لگایا کہ بال ادھر ادھر منتشر نہ ہو جائیں۔ پھر پان لگائے چونا زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لئے منہ میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن اس نے سمجھا شاید پان کھانے کا یہی مزہ ہے۔ آخر کڑوی مرچ بھی تو لوگ مزے لے لے کر کھاتے ہی ہیں۔ گلابی رنگ کی ساڑھی پہن کر اور پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر اُس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو اُس کے آبنوسی رنگ پر سرخی دوڑ گئی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر شرما گئی۔ افلاس کی آگ میں نسائیت بھی جل کر خاک سیاہ ہو جاتی ہے۔ نسائیت کی حیا کا ذکر ہی کیا ہے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر شرمانا ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی چنوں میں خوشبو لگا کر کھائے۔

اسی طرح بناؤ سنگار کر کے بنٹی بھوندو کی راہ دیکھنے لگی۔ جب دیر ہو گئی اور وہ نہ آیا تو اس پر جھنجھلا اٹھی۔ "روز تو سانجھ سے دروازے پر پڑے رہتے تھے۔ آج نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ رہے"! بنٹی کے سوکھے دل میں

آج پانی پڑتے ہی اُس کی نسائیت اُگ آئی تھی خفگی کے ساتھ اُسے فکر بھی ہو رہی تھی۔ اُس نے باہر نکل کر کتنی مرتبہ پکارا۔ اُس کی آواز میں ایسی شیرینی کبھی نہ تھی۔ اُسے کئی مرتبہ شبہ ہُوا کہ بھوندو آرہا ہے۔ وہ دوسری مرتبہ سرکی کے اندر دوڑ آتی۔ اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا کہ کچھ بگڑ نہ گیا ہو۔ ایسی دھڑکن ایسی الجھن اُسے آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔

بنٹی شوہر کے انتظار میں ساری رات بے قرار رہی۔ جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی۔ اُس کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے۔ آج ہی اُس کی پُرلطف زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ آج ہی یہ حال۔

صبح جب وہ اُٹھی تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا۔ اس کا جسم شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی، حلق خشک ہو رہا تھا۔

دفعتاً کسی نے آکر کہا "اری بنٹی رات بھوندو پکڑا گیا"

(۴)

بنٹی تھانے پہنچی۔ تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی اور دم پھول رہا تھا۔ اُسے بھوندو پر رحم نہ آتا تھا۔ غصہ آتا تھا۔ سارا زمانہ کام کرتا ہے۔ اور چین کی بنسی بجاتا ہے۔ اُنہوں نے کہنے سُننے پر ہاتھ بھی لگایا تو چوک گئے۔ شعور نہ تھا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتی تھی۔ کہ آگ میں کود پڑو۔

اُسے دیکھتے ہی تھانیدار نے دھونس جمائی۔ "یہی تو ہے بھوندو کی عورت، اسے بھی پکڑ لو۔"

بنٹی نے اکڑ کر کہا۔ "ہاں ہاں پکڑ لو۔ یہاں کسی سے نہیں ڈرتے۔ جب ڈرنے کا کام نہیں کرتے تو ڈریں کیوں؟"

افسر اور ماتحت سب بنٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کا دل بھوندو کی طرف سے کچھ نرم ہو گیا۔ اب تک وہ دھوپ میں کھڑا تھا۔ اب اُسے سائے میں لے آئے۔ اس نے ایک مرتبہ بنٹی کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا۔ دیکھنا کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آ جانا۔"

تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا " ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو۔ جیسے پاکیزگی کی دیوی ہی تو ہے۔ مگر اس پھیر میں نہ رہنا۔ میں تم لوگوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تین سال کے لئے بھجوا دونگا۔ تین سال کے لئے صاف صاف کہہ دو اور سارا مال لوٹا دو۔ اسی میں خیریت ہے۔"

بھوندو نے بیٹھے بیٹھے کہا " کیا کہہ دوں۔ جو لوگوں کو لوٹتے ہیں اُن سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ جو غریب محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ اُن کا گلا کاٹنے کو سبھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے۔ کہ ہمارے پاس کسی کو دینے دلانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

تھانیدار نے سخت لہجہ میں کہا " ہاں ہاں! سکھا پڑھا دے۔ بیوی کو کہ کہیں کچھ بھید نہ کھول دے۔ لیکن ان گیدڑ بھبکیوں سے بچ نہیں سکتا۔ تو نے اقبال نہ کر لیا تو تین سال کے لئے جائے گا۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ ارے چھوٹے سنگھ اسے پکڑ کر کوٹھڑی میں بند کر دے۔"

بھوندو نے بے پروائی سے کہا " داروگا ساب! بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو مگر کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ آپ کی دھمکیوں کے سامنے بڑے بڑے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ مگر میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔"

داروغہ صاحب کو یقین ہو گیا۔ کہ اس فولاد کا جھکانا دشوار ہے۔ بھوندو کے بشرہ سے شہیدوں کا سا استقلال نظر آتا تھا۔ تھانیدار کا

حکم پاتے ہی دو آدمیوں نے بھونڈو کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا۔ شوہر کی بے بسی دیکھ کر بنتی کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کنجڑوں میں چوری کر کے اقبال کر لینا انتہا درجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو؟ خدا جانے کتنی سزا ہو جائے۔ ممکن ہے تین ہی سال کے لئے چلا جائے۔ جان پر کھیل کر بولی۔" داروگا جی! تم سمجھتے ہو گے ان غریبوں کی پیٹھ پر کوئی نہیں ہے۔ لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بھلا چاہو تو ان کو چھوڑ دو کیا ہو گئے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی"۔

تھانیدار نے مسکرا کر کہا" تجھے کیا یہ مر جائے گا۔ کسی اور سے بیاہ کر لینا۔ جو کچھ چوری کر کے لایا ہو گا۔ وہ تو تیرے ہی پاس ہو گا۔ کیوں نہیں اقبال کر کے چھڑا لیتی۔ میں وعدہ کرتا ہوں مقدمہ نہ چلاؤں گا۔ سب مال لوٹا دے۔ تو نے ہی منتر دیا ہو گا۔ گلابی ساڑھی اور پان اور خوشبودار تیل کے لئے تو ہی بیقرار ہو رہی ہو گی۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے اور سامنے کھڑی دیکھ رہی ہے۔ عجیب عورت ہے"۔

بنتی نے چند لمحے غور کیا۔ اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

"اچھا داروگا ساب! میں سب کچھ دے دوں گی۔ ان پر حرف نہ آنے پائے۔

(۵)

بھونڈو کو باہر نکالا گیا۔ تو اس نے خائف ہو کر پوچھا" کیوں کیا بات ہے"؟

ایک چوکیدار نے کہا" تیری عورت نے اقبال کر لیا"۔

بھونڈو پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اس کا سر چکر کھا رہا تھا۔ آواز بند سی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ بات سنتے ہی جیسے وہ بیدار ہو گیا۔ اس لئے دونوں

سمٹیاں کس لیں اور بولا "کیا کہا؟"

"کیا کہا؟ چوری کھل گئی۔ داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں۔ رات ہی اقبال کر لیتے، تو یہ نوبت کاہے کو آتی۔"

بھونڈو نے گرج کر کہا "وہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"وہاں مال بھی برآمد ہو گیا۔ تم ابھی تک اپنی ہی گا رہے ہو۔"

اپنے آبا و اجداد کی وضعداری اپنے ہاتھوں خاک میں ملتے دیکھ کر بھونڈو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلت کے بعد اب اُسے اپنی زندگی میں رسوائی اور نفرت اور بے عزتی کے سوائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اب اس نے سوچا۔ وہ اپنی برادری میں کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔

یکایک بنٹی آ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کہ بھونڈو کی خونخوار شکل دیکھ کر اُسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُسے دیکھتے ہی بھونڈو کا مجروح خاندانی وقار کچلے ہوئے سانپ کی مانند تڑپ اٹھا اس نے بنٹی کو آتشیں آنکھوں سے دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں خون کی آگ جل رہی تھی۔ بنٹی سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اور الٹے پاؤں وہاں سے بھاگی۔

کسی دیوتا کے آہنی ہتھیاروں کی مانند وہ دونوں انگاروں کی سی آنکھیں اُس کے دل میں چبھنے لگیں۔

تھانے سے نکل کر بنٹی نے سوچا۔ اب کہاں جاؤں؟ بھونڈو اس کے ساتھ ہوتا تو وہ پڑوسیوں کے طعنے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن اب وہ اکیلی تھی۔ اُس کے لئے گھر جانا ناممکن تھا۔ اور بھونڈو کی وہ دو انگارے کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ لیکن کل کی عیش و آرام کی

چیزوں کا پیار اُسے ڈیرے کی طرف کھینچنے لگا۔ شراب کی بوتل اب بھی بھری رکھی تھی۔ پھلوڑیاں چھینکے پر ہانڈی میں پڑی تھیں۔ وہ تشنہ آرزوئیں جو موت کو سامنے دیکھ کر بھی دنیا کی نعمتوں کی طرف دل کو مائل کرتی ہیں۔ اُسے کھینچ کر ڈیرہ کی طرف لے چلیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ پڑاؤ پر پہنچی۔ تو سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جو جگہ رنگینیِ حیات سے گلزار بنی ہوئی تھی۔ اب وہاں سوائے ویرانے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ برادری کا انتقام تھا۔ سب نے سمجھ لیا کہ بھونڈو اب ہمارا آدمی نہیں صرف اُس کی سر کی اس ویرانے میں گو یادگار ہوئی کھڑی تھی۔ بنٹی نے اس کے اندر پاؤں رکھا۔ تو اُس کی وہی حالت ہوئی۔ جو خالی گھر دیکھ کر کسی چور کی ہوتی ہے کون کونسی چیز اٹھائے! اس جھونپڑی میں اُس نے رو رو کر پانچ برس کاٹے تھے لیکن آج اُسے اس سے وہ محبت پیدا ہو گئی تھی، جو کسی ماں کے دل میں اپنے نالائق بیٹے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ جو برسوں کے بعد پردیس سے لوٹا ہو۔ ہوا سے کچھ اشیاء اِدھر اُدھر ہو گئی تھیں۔ اُس نے انہیں اُٹھا کر اُن کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھلوڑیوں کی ہانڈی کچھ ہل گئی تھی۔ بنٹی کو شبہ ہُوا کہ شاید اس پر کوئی بلی جھپٹی ہو۔ اُس نے جلدی سے ہانڈی اُتار کر دیکھا۔ پھلوڑیاں کسی نے چھیڑی تھیں۔ پانوں پر جو گیلا کپڑا لپٹا تھا۔ وہ خشک ہو گیا تھا۔ اُس نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پاکر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بھونڈو آ رہا ہے۔ اس کی وہ انگارے کی سی آنکھیں! بنٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے بھونڈو کے غصہ کا اُسے ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن اُس نے دل کو مضبوط کیا۔ کیوں مارے گا۔ کچھ سُنے گا۔ سوال جواب کرے گا۔ یونہی گنڈاسا

چلا دے گا۔ اُس نے اُس کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی۔ اُسے آفت سے بچایا ہے۔ مرجا دا جان سے پیاری نہیں ہوتی۔ بھوندُو کو ہو گی اُسے نہیں ہے۔ کیا اتنی سی بات پر وہ اُس کی جان لے گا "

اُس نے سرکی کے دروازہ سے جھانک کر دیکھا۔ بھوندُو نہ تھا۔ اُس کا گدھا آ رہا تھا۔ بنٹی آج اُس بدبخت گدھے کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئی جیسے اپنا بھائی میکے سے بتاشوں کی پوٹلی لئے تھکا ماندہ چلا آ رہا ہو۔ اُس نے جا کر اس کی گردن سہلائی اور اُس کے تھوتھنے کو منہ سے لگا لیا۔ وہ اُسے پھوٹی آنکھوں نہ بھاتا تھا۔ پھر آج اُسے اپنا عزیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔ وہ پھر کانپ اُٹھی۔

اُس نے پھر سوچا۔ کیا کسی طرح نہ چھوڑے گا۔ وہ روتی ہوئی اُس کے پیروں پر گر پڑے گی۔ کیا تب بھی نہ چھوڑے گا۔ ان کی آنکھوں کی وہ کتنی تعریف کیا کرتا تھا۔ کیا آج ان میں آنسو دیکھ کر بھی اُسے رحم نہ آئیگا۔ بنٹی نے مٹی کے پیالے میں شراب انڈیل کر لی اور پھلوڑیاں کھائیں۔ جب اُسے مرنا ہی ہے۔ تو دل میں حسرت کیوں رہ جائے۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اب بھی اُس کے سامنے تھیں۔ اُس نے دوسرا پیالہ بھرا۔ اور وہ بھی پی گئی۔ زہریلا تھرّا جیسے دوپہر کی گرمی نے اور بھی قاتل بنا دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اُس کے دماغ کو گھمانے لگا۔ بوتل آدھی رہ گئی۔

اُس نے سوچا۔ بھوندُو پوچھے گا۔ تو نے اتنی دارو کیوں پی؟ تو وہ کیا کہے گی۔ کہہ دیگی۔ ہاں پی۔ کیوں نہ پیئے۔ اسی کے لئے تو یہ سب کچھ ہوا۔ وہ ایک بوند بھی نہ چھوڑے گی۔ جو ہونا ہے ہو جائے۔ بھوندُو اُسے مار نہ سکے گا۔ وہ اتنا ظالم، اتنا کمینہ نہیں ہے۔ اُس نے پھر پیالہ بھرا اور پی گئی۔ پانچ برس کی

گزری ہوئی باتیں اُسے یاد آنے لگیں۔ سینکڑوں مرتبہ دونوں میں لڑائیاں ہوئی تھیں۔ آج بنٹی کو ہر مرتبہ اپنی ہی زیادتی معلوم ہو رہی تھی۔ بیچارا جو کچھ کماتا ہے، اُسی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ اپنے لئے ایک پیسہ کا تمباکو بھی لیتا ہے تو پیسہ اُسی سے مانگتا ہے۔ صبح سے شام تک بن بن پھرتا ہے۔ جو کام اس سے نہیں ہوتا اُسے کیونکر کرے۔

معاً ایک کانسٹیبل نے آکر کہا "ارے بنٹی! کہاں ہے۔ چل دیکھ بھوندو کا کاحال، بے حال ہو رہا ہے۔ ابھی تک تو چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آیا کہ ایک پتھر پر سر ٹپک دیا۔ سر سے لہو بہ رہا ہے۔ ہم لوگ دوڑ کر پکڑ نہ لیتے تو جان ہی دے دی تھی"

(۹)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ موسلا دھار برکھا ہو رہی تھی۔ بھوندو کی سرکی اب بھی اُس ویرانے میں کھڑی تھی۔ بھوندو کھٹولی پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اور جسم مرجھا گیا تھا۔ وہ فکر مندانہ انداز سے بارش کی طرف دیکھتا ہے۔ چاہتا ہے اٹھ کر باہر دیکھوں۔ مگر اٹھا نہیں جاتا۔

بنٹی سر پر گھاس کی ایک گٹھڑی لئے پانی میں شرابور آتی دکھائی دی۔ وہی گلابی ساڑھی ہے پر تار تار۔ لیکن اس کا چہرہ کھلا ہُوا ہے۔ رنج و افسوس کی جگہ اس کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی ہے۔ چال ایسی مستانہ ہے۔ آنکھیں ایسی چمکتی ہیں۔ کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔ بھوندو نے آہستہ آہستہ کہا "تو اتنی بھیگ رہی ہے۔ کہیں بیمار پڑ گئی۔ تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا۔ میں کہتا ہوں۔ تو اتنا کیوں مرتی ہے۔ دو گھٹے تو بیچ

چپکی تھی۔ اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہانڈی میں کیا لائی ہے۔"

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا: "کچھ بھی تو نہیں ہے۔ کیسی ہانڈی؟"

بھوندو زور لگا کر کھٹولی سے اُٹھا۔ آنچل کے نیچے چھپی ہوئی ہانڈی کھول اور اس کے اندر نظر ڈال کر بولا: "ابھی لوٹا۔ نہیں تو ہانڈی پھوڑ دوں گا۔"

بنٹی نے دھوتی نچوڑتے ہوئے کہا: "ذرا آئینہ میں صورت دیکھو۔ گھی دودھ کچھ نہ ملے گا۔ تو کیسے اُٹھو گے۔ یا ہمیشہ چارپائی پر ہی پڑے رہنے کا ارادہ ہے؟"

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹے ہوئے کہا: "اپنے لئے تو ایک ساڑھی بھی نہیں لائی۔ میرے لئے گھی اور دودھ سب چاہیئے۔ میں گھی نہ کھاؤں گا۔"

بنٹی نے مسکرا کر کہا: "اسی لئے تو گھی کھلاتی ہوں۔ کہ تم جلدی سے کام دھندا کرنے لگو اور میرے لئے ساڑھی لاؤ۔"

بھوندو بولا: "تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں۔ کیوں؟"

بنٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا۔ "پہلے میرا گلا کاٹ دینا پھر جانا۔"

٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭

شکار

پھٹے پرانے کپڑوں والی منیا نے رانی دسودھا کے چاند سے مکھڑے کی طرف دیکھا۔ اور راجکمار کو گود میں لیتے ہوئے کہا "ہم غریبوں کا اس طرح کیسے گزارہ ہو سکتا ہے۔ مہارانی! میری تو اپنے آدمی سے ایک دن نہ پٹے۔ میں اُسے گھر میں نہ گھسنے دوں۔ ایسی کھری کھری سناؤں کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔

رانی دسودھا نے سنجیدگی سے مسکرا کر کہا "کیوں وہ کہے گا۔ تو میری باتوں میں بولنے والی کون ہے۔ میں جو چاہوں کروں۔ تو اپنا روٹی کپڑا لیتی جا، تجھے میری دوسری باتوں سے کیا غرض۔ میں تیرا غلام نہیں ہوں"

منیا تین ہی دن ہوئے یہاں لڑکوں کو کھلانے کے لئے نوکر ہوئی تھی، اس سے قبل دو چار بھلے گھروں میں کھانا پکانے پر نوکر رہ چکی تھی۔ مگر رانیوں سے بات چیت کرنے کا سلیقہ اُسے ابھی تک نہ آیا تھا۔ اُس کا سوکھا ہوا چہرہ جوش سے تمتما اٹھا۔ بلند آواز سے بولی۔ جس دن ایسی باتیں منہ سے نکالے گا۔ مونچھیں اکھاڑ لوں گی۔ سرکار! وہ میرا غلام نہیں ہے، تو کیا میں ہی اس کی لونڈی ہوں۔ میں خود نہیں کھاتی اُسے کھلا دیتی ہوں۔ کیونکہ وہ مرد بچہ ہے۔ بیلے داری میں اُسے مشقت کرنا پڑتا ہے۔ خود پھٹے پرانے کپڑے پہنتی ہوں۔ لیکن اُسے

میلا کپڑا نہیں پہننے دیتی۔ جب میں اُس کے لئے اتنا کرتی ہوں تو اُس کی کیا مجال ہے کہ مجھے آنکھیں دکھا جائے۔ اپنے گھر کو آدمی اس لئے چھانتا پوتتا ہے کہ اُس سے برکھا رُت کے وقت بچاؤ ہو۔ اگر یہ اندیشہ لگا رہے کہ گھر جانے کب گر پڑے گا۔ تو ایسے گھر میں کون رہیگا۔ اس سے تو روکھ تلے جا بیٹھنا کہیں اچھا۔ نکل جانے کہاں بیٹھا گُلّا بجاتا رہا۔ دس بجے رات کو لوٹا میں رات بھر اُس سے بولی ہی نہیں۔ لگا پیروں پڑنے۔ گھگھیانے۔ تب میرا دل پسیج گیا یہی مجھ میں عیب ہے۔ مجھ سے اُس کا غمگین چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ اسی لئے وہ کبھی کبھی شیر ہو جاتا ہے۔ لیکن اب میں بھی پکی ہو گئی ہوں۔ پھر کسی دن لگاڑ کیا تو یاد ہی کرے گا۔ یا وہ ہی رہے گا۔ یا میں ہی رہونگی۔ جو بیٹھ کر کھائے۔ وہ دھونس سہے یہاں برابر کی کمائی کرتی ہوں"۔

دسودھا نے اُسی انداز سے پھر پوچھا "اگر وہ تجھے بٹھا کر کھلاتا تب تو اس کی دھونس سہتی"۔

مُنیا جیسے لڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ بولی "بٹھا کر کوئی کیا کھلائے گا سرکار! مرد باہر کا کام کرتا ہے تو ہم بھی گھر میں کام کرتے ہیں۔ یا گھر کے کام میں محنت نہیں کرنی پڑتی۔ باہر کے کام سے تو رات کو چھٹی مل جاتی ہے۔ گھر کے کام سے تو رات کو بھی چھٹی نہیں ملتی۔ مرد یہ چاہے کہ مجھے گھر میں بٹھا کر آپ سیر سپاٹے کرتا پھرے تو مجھ سے تو نہ برداشت ہوگا"۔

یہ کہتے ہوئے مُنیا راجکمار کو لئے ہوئے باہر چلی گئی۔ دسودھا نے تھکی ہوئی آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر ہرا بھرا باغ تھا جس کے رنگا رنگ پھول اپنی چند روزہ بہار کا جوبن دکھا رہے تھے۔ اور پیچھے ایک عالیشان سندر آسمان میں اپنا سنہرا سر اُٹھائے سورج سے آنکھیں ملا رہا تھا۔ عورتیں

رنگ برنگ کے کپڑے پہنے پوجا کرنے آ رہی تھیں۔ مسند کے دائیں طرف تالاب میں کنول صبح کے سرور میں مسکرا رہے تھے۔ لیکن قدرت کی اس دلآویزی میں بھی یہ طاقت نہ تھی۔ کہ وسودھا کی طبیعت کو ہرا کر دیتی۔ اُسی تالاب کے کنارے مالی کا ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ وسودھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ باغ و بہار کے درمیان کھڑا وہ سُونا جھونپڑا اُس کے عیش و عشرت سے بھرے ہوئے دل کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ جا کر جھونپڑے کے گلے لپٹ جاؤں۔ اور خوب روؤں۔

وسودھا کو یہاں آئے پانچ سال گزر گئے تھے۔ پہلے وہ اپنی خوش نصیبی پر پھولی نہ سماتی تھی۔ ماں باپ کے چھوٹے سے کچے گھر کو چھوڑ کر وہ اس محل میں آ گئی تھی۔ جہاں دولت اُس کے پیر چومتی تھی۔ اس وقت دولت ہی اس کی آنکھوں میں سب کچھ تھی۔ شوہر کی محبت دوسرے درجہ پر تھی۔ لیکن اس کا حریص دل دولت پر مطمئن نہ رہ سکا۔ شوہر کی محبت کے لئے ہاتھ پھیلانے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد اُسے معلوم ہوا۔ مجھے یہ دولت بھی میسر ہے۔ مگر چند ہی دنوں میں یہ وہم دور ہو گیا۔ کنور گجراج سنگھ خوب صورت تھے۔ مالپرست تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ بذلہ سنج تھے۔ اور محبت کا پارٹ کرنا بھی جانتے تھے۔ مگر اُن کی زندگی میں محبت سے مرتعش ہونے والا تار نہ تھا۔ وسودھا کا کھلا ہوا شباب اور دیوتاؤں کو بھی لبھا لینے والا رنگ روپ محض ان کی دل بستگی کا سامان تھا۔ گھڑ دوڑ اور شکار جیسے ولولہ انگیز مشاغل کے درمیان دب کر محبت پیلی اور بے جان ہو گئی تھی۔ اور محبت سے محروم ہو کر اب وسودھا کا دل اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتا تھا۔ وہ چاند سے بچے پا کر بھی وہ خوش نہ تھی۔ کنور صاحب ایک مہینہ سے زیادہ ہوا شکار

کیے لیے گئے۔ اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔ اور یہ اپنی قسم کا پہلا موقعہ نہ تھا۔ ہاں اب اُس کی مدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے ایک ہفتہ میں لوٹ آتے تھے۔ پھر دو ہفتوں کا دَور چلا۔ اور اب ایک مہینے کی خبر لینے لگے۔ سال میں تین چار مہینے شکار کی نظر ہو جاتے تھے۔ شکار سے لوٹتے تو گھر دوڑ کر راگ چھڑ جاتا۔ کبھی میرٹھ کبھی پونا۔ کبھی بمبئی۔ کبھی کلکتہ۔ گھر پر بھی رہتے تو رئیس زادوں کے ساتھ گپ شپ اڑایا کرتے۔ شوہر کے لچھن دیکھ کر وسودھا دل ہی دل میں کڑھتی اور گھلتی جاتی تھی۔ کچھ دنوں سے ہلکا ہلکا بخار بھی آنے لگا۔

وسودھا بڑی دیر تک بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر ٹیلیفون پر جاکر اُس نے ریاست کے مینیجر سے پوچھا "کنور صاحب کی کوئی چٹھی آئی؟"

جواب ملا۔ "جی ہاں! ابھی چٹھی آئی ہے۔ کنور صاحب نے ایک بہت بڑا شیر مارا ہے۔"

وسودھا نے جل بھن کر کہا "میں یہ نہیں پوچھتی، آنے کو کب لکھا ہے؟"

مینیجر "آنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔"

رانی "یہاں سے اُن کا پڑاؤ کتنی دور ہے؟"

مینیجر "یہاں سے؟ دو سو میل سے کم نہ ہوگا۔ پہلی بھیت کے جنگلوں میں شکار ہو رہا ہے۔"

رانی "میرے لئے دو موٹروں کا انتظام کر دیجئے۔ میں آج ہی وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

فون میں کئی منٹ بعد جواب ملا "ایک موٹر تو وہ ساتھ لے گئے ہیں۔ ایک حاکم ضلع کے بنگلہ پر بھیج دی گئی ہے۔ تیسری مینیجر بنک کی سواری

ہیں ہے۔ چو کھٹی کی مرمت ہو رہی ہے۔"

رانی وسودھا کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ بولی "کس کے حکم سے مینیجر بنک اور حاکم ضلع کو موٹریں بھیجی گئی ہیں۔ آپ دونوں منگوا لیجئے۔ میں آج ضرور جاؤں گی۔"

مینیجر "میں ابھی منگوائے دیتا ہوں۔"

وسودھا نے سفر کی تیاری کرنی شروع کر دی۔ اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا تصفیہ کر لیا۔ وہ قابل رحم زندگی بسر نہ کرے گی۔ وہ جا کر کنور صاحب سے کہے گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی دولت کی لونڈی بن کر رہوں۔ تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ کی شان و شوکت آپ کو مبارک ہو میرا اختیار آپ کی دولت پر نہیں ہے۔ آپ پر ہے۔ اگر آپ مجھ سے جو دور ہٹنا چاہتے ہیں۔ تو میں آپ سے ہاتھ بھر ہٹ جاؤں گی۔ اس طرح کی کتنی ہی باتیں اس کے دل میں پانی کے بلبلوں کی طرح اٹھ رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دروازہ پر آ کر پکارا "میں اندر آ جاؤں؟"

وسودھا نے عاجزی سے کہا "آج معاف کیجئے۔ میں ذرا پیلی بھیت جا رہی ہوں۔"

ڈاکٹر نے حیرت سے کہا "آپ پیلی بھیت جا رہی ہیں۔ بخار بڑھ جائیگا اس حالت میں آپ کو جانے کا مشورہ نہ دوں گا۔"

وسودھا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "بڑھ جائے گا۔ بڑھ جائے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔"

بوڑھا ڈاکٹر پردہ اٹھا کر اندر گیا۔ اور وسودھا کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا "لائیے ٹمپریچر لے لوں۔ اگر ٹمپریچر زیادہ ہوا۔ تو میں نہ جانے دوں گا۔"

وسودھا۔ "ٹھہر پھر لینے کی ضرورت نہیں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"
ڈاکٹر۔ "صحت کا خیال رکھنا آپ کا پہلا فرض ہے۔"
وسودھا نے مسکرا کر کہا۔ "آپ اطمینان رکھئے میں اتنی جلدی مری نہیں جا رہی ہوں۔ پھر اگر کسی بیماری کی دوا موت ہی ہو۔ تو آپ کیا کرینگے۔"
ڈاکٹر نے ایک دو مرتبہ اور زور دیا۔ پھر تعجب سے سر ہلا کر چلا گیا۔

(۳)

ریل گاڑی سے جانے میں آخری سٹیشن سے دس کوس تک غیر آباد جنگلی رستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے کنور صاحب ہمیشہ موٹر ہی سے جایا کرتے تھے۔ وسودھا نے بھی اسی راستہ سے جانے کا فیصلہ کیا۔ دس بجتے بجتے دونوں موٹریں آگئیں۔ وسودھا نے سارا غصہ ڈرائیوروں پر اُتارا۔ "اب اگر میرے حکم کے بغیر کہیں موٹر لے گئے تو کان پکڑ کر نکال دوں گی۔ اچھی دل لگی ہے۔ گھر کی روٹیاں بن گئی ہیں۔ موٹریں لوگ اپنے لئے رکھتے ہیں غیروں کے لئے نہیں۔ جسے سواری کا شوق ہو خرچ کرے۔ یہ نہیں کہ حلوائی کی دکان دیکھی اور فاتحہ پڑھنے بیٹھ گئے۔"

وہ چلی تو دونوں بچے رونے لگے۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ اماں بڑی دور ہوا مارنے جا رہی ہیں۔ تو اُن کی آتش شوق سرد ہو گئی۔ وسودھا نے آج صبح سے انہیں پیار نہ کیا تھا۔ اُس نے غصہ میں سوچا "میں کیوں انہیں پیار کروں۔ کیا میں لئے ہی پیار کا ٹھیکہ لیا ہے۔ وہ تو وہاں چین سے بیٹھے رہیں۔ میں انہیں چھاتی سے لگائے رہوں۔ لیکن چلتے وقت ماں کا دل بیتاب ہو گیا۔ دونوں کو باری باری سے گود میں اُٹھا کر پیار کیا۔ اور گھنٹہ بھر میں لوٹ آنے کا حکم دے کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ راہ میں بھی بچوں کی یاد بار بار آتی

رہی۔ موٹر جس رفتار سے آگے جا رہی تھی۔ اسی رفتار سے اس کا دل سامنے کے درختوں کے ساتھ پیچھے کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ کئی مرتبہ خواہش ہوئی گھر لوٹ جاؤں۔ جب انہیں میری پروا نہیں، تو میں ہی کیوں اُن کے لئے جان دوں۔ خواہ آئیں یا نہ آئیں۔ پھر خیال آیا۔ ایک مرتبہ جا کر کھری کھری سُنا آؤں۔ تو چین پڑے۔ سارا جسم تھک کر جوڑ جوڑ ہو رہا تھا۔ بخار بھی ہو گیا تھا۔ سر درد کے مارے پھٹا پڑتا ہے۔ لیکن اپنی ارادہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ رات کے دس بجے ڈاک بنگلے میں پہنچی۔ تو اُسے تن بدن کی سُدھ نہ تھی۔

شوفر کی آواز سُنتے ہی کنور صاحب باہر نکل آئے۔ اور پوچھا "تم یہاں کیسے آ گئے۔ خیریت تو ہے؟"

شوفر نے قریب آ کر کہا "رانی صاحبہ آئی ہیں۔ حضور! راہ میں بخار ہو گیا۔ بے ہوش پڑی ہیں"۔ کنور صاحب نے وہیں کھڑے سخت لہجہ میں پوچھا "تو تم انہیں واپس کیوں نہ لے گئے کیا تمہیں معلوم نہ تھا۔ یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے"

شوفر نے سٹپٹا کر جواب دیا "حضور! وہ کسی طرح مانتی ہی نہ تھیں۔ میں کیا کرتا"

کنور صاحب نے ڈانٹ کر کہا "چپ رہو۔ باتیں نہ بناؤ۔ تم نے سمجھا ہوگا۔ شکار کی بہار دیکھیں گے۔ اور بڑے بڑے سوئیں گے۔ تم نے واپس چلنے کو کہا ہی نہ ہوگا۔ میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم کو موٹر لے کر اسی وقت لوٹنا پڑے گا۔ اور کون کون ساتھ ہے؟"

شوفر نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا "ایک موٹر پر بستر اور کپڑے

ہیں۔ ایک پر خود رانی صاحبہ ہیں "

کنور "یہیں اور کوئی ساتھ نہیں ہے "

شوفر "حضور! ہیں تو حکم کا بندہ ہوں "

کنور "بک بک مت کرو جی "

یوں چِلّاتے ہوئے کنور صاحب دسودھا کے پاس گئے۔ اور آہستہ سے پکارا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے آہستہ سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی توے کی طرح تپ رہی تھی۔ اس بخار کی آنچ نے گویا اُن کے غصّہ کی آگ کو سرد کر دیا۔ لپک کر بنگلے میں گئے۔ سوئے ہوئے آدمیوں کو جگایا۔ پلنگ بچھوایا۔ بے ہوش دسودھا کو گود میں اٹھا کر اندر لے گئے۔ اور پلنگ پر لٹا دیا۔ پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر اُسے اشک آلود نگاہوں سے تاکنے لگے۔ اس کے گرد سے بھرے ہوئے چہرے اور بکھرے ہوئے بالوں میں آج اُنہیں بے غرض محبت نظر آئی۔ آج تک انہوں نے دسودھا کو خود پرست نازنین کے روپ میں دیکھا تھا جسے اُن کے پیار کی پروانہ تھی۔ جو اپنے بناؤ سنگار میں مست تھی۔ آج گرد وغبار کے پوڈر اور پومیڈ میں انہوں نے اس کی نسائیت دیکھی۔ اس میں کتنی حسرت تھی۔ کتنی التجا۔ اپنی پرواز کے سرور میں ڈوبی ہوئی چڑیا اب پنجرے کے دروازہ پر آکر پھڑ پھڑا رہی تھی کیا پنجرے کا دروازہ کھُل کر اُس کا خیر مقدم نہ کرے گا؟

کنور صاحب نے شیریں لہجہ میں کہا "جی ہاں! اتنے آدمی تھے کسی کو ساتھ نہ لیا۔ ریل گاڑی میں بڑے آرام سے آسکتی تھیں۔ یہاں سے موٹر بھیج دی جاتی۔ کتنا تیز بخار ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا" پھر اُنہوں نے باورچی کو کہا "ذرا سا پانی گرم کرو۔ اور دیکھو کچھ کھانے کو بنا لو"

باورچی نے کہا "سو کوس کی دوڑ بہت ہوتی ہے۔ سرکار! سارا دن بیٹھے بیٹھے بیت گیا۔"

کنور صاحب وسودھا کے سر کے نیچے سرہانہ سیدھا کر کے بولے "ابھی ہم لوگوں کا کچھ نہ بگڑا اس سے پہلے ہی... ہم لوگوں کا کچھ مز نکل جاتا ہے۔ پھر ان کی کیا ہے۔ ایسی بے ہودہ سڑک دنیا بھر میں نہ ہوگی۔"

(۳۳)

وسودھا کا بخار بارہ دن تک نہ اترا۔ گھر سے ڈاکٹر آئے۔ دونوں بچے، دنیا، نوکر چاکر سبھی آ گئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ وسودھا پلنگ پر پڑے کنور صاحب کی تندہی اور خدمت گزاریاں دیکھتی اور خوش ہوتی تھی۔ دس بجے تک جس کی آنکھ نہ کھلتی تھی۔ وہی کنور صاحب اب منہ اندھیرے ہی اٹھ بیٹھتے تھے۔ اور اس کی دوا دارو کا فکر کرنے لگتے تھے۔ ذرا سی دیر کے لئے نہانے کو جاتے، پھر آ کر بیٹھ جاتے۔ جیسے تپسیا کر رہے ہوں۔ ان کی صحت بگڑتی جاتی تھی۔ چہرے پر وہ سرخی اور چمک نہ تھی۔ تھکے تھکے معلوم ہوتے تھے۔

ایک دن وسودھا نے پوچھا "تم آج کل شکار کھیلنے کیوں نہیں جاتے ہیں تو شکار کھیلنے ہی آئی تھی۔ نہ جانے کیسی بری ساعت میں چلی کہ تمہیں اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ ذرا آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھو۔"

کنور صاحب کو اتنے دنوں تک کبھی شکار کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ نہ اس کا کبھی چرچا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شکاری نے کسی شیر کا ذکر کیا تھا۔ کنور صاحب نے اس کی طرف ایسی قہر کی نگاہوں سے دیکھا کہ اسے دوبارہ ہمت نہ پڑی۔ اب وہ چاہتے تھے۔ ہمیشہ وسودھا کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں

کرتے رہیں پل بھر کو بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوں۔ وسودھا کے منہ سے شکار کا ذکر سن کر اُن کا سر ندامت سے جھک گیا۔ آہستہ سے بولے: "ہاں شکار کھیلنے کا اس سے اچھا اور کون موقعہ ہوگا۔"

وسودھا بولی: "میں تو اب اچھی ہوں۔ ذرا اپنی صورت دیکھو بیمار کے پاس بیٹھ کر آدمی سچ مچ بیمار ہو جاتا ہے۔"

وسودھا نے تو معمولی سی بات کہی تھی۔ پر کنور صاحب کے دل پر وہ چنگاری کی مانند لگی۔ اس سے پہلے وہ اپنے شکار کے جنون پر کئی مرتبہ پچھتا چکے تھے۔ سوچتے تھے۔ اگر یوں شکار کے پیچھے نہ پڑتے تو وسودھا بیمار کیوں ہوتی، یہ سب میرا ہی قصور ہے۔

وسودھا پھر بولی: "اب کے تم نے کیا کیا تحفے جمع کئے۔ ذرا منگواؤ۔ میں بھی دیکھوں۔ اُن میں جو سب سے اچھا ہوگا وہ میں لوں گی۔ اور ایک بات اور سن لو۔ اب کے تمہارے ساتھ میں بھی شکار کھیلنے چلوں گی۔ لے چلو گے نا! بہانے مت بنانا، میں ایک نہ سنوں گی۔"

اپنے شکاری تحفے دکھانے کا کنور صاحب کو مرض تھا۔ سینکڑوں کھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ اُن کے کمروں میں فرش، گدے، کوچ، کرسیاں، مونڈھے سب کھالوں کے تھے۔ اوڑھنا اور بچھونا بھی کھالوں کا ہی تھا۔ کھالوں کے کئی سوٹ تیار کئے تھے۔ شکار کے موقعہ پر وہی سوٹ پہنتے تھے۔ اب کے بھی بہت سے سینگ بیچے۔ کھالیں جمع کی تھیں۔ اُنہوں نے سوچا۔ وسودھا یہ چیزیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ یہ نہ سمجھا کہ اُس نے صدر دروازہ بند پا کر چور دروازہ سے گھسنے کی کوشش کی ہے۔ جا کر وہ اشیا اٹھا لائے۔ اور ایک ایک کر کے دکھانے لگے۔ وسودھا کے چہرے پر ایسی رونق ہفتوں سے

نہ تھی۔ جیسے کوئی بچہ تماشا دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔ بیماری کے بعد ہم بچوں کی طرح ضدی ۔ ویسے ہی متلوّن مزاج ۔ ویسے ہی سادہ لوح بن جاتے ہیں ۔

دسودھا ایک ایک کھال کو ایسی دل چسپی سے دیکھنے لگی۔ جیسے بائیسکوپ میں ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر آرہی ہو۔ سب سے خوبصورت ایک شیر کی کھال تھی۔ وہ اُس نے اپنے لئے پسند کی۔ کنور صاحب کی یہ سب سے قیمتی چیز تھی، وہ اُسے اپنے کمرے میں لٹکانا چاہتے تھے۔ بولے "تم کسی چیتے کی کھال لے لو، یہ تو کوئی عمدہ چیز نہیں ہے"

دسودھا نے کھال کو اپنی طرف کھینچ کر کہا "رہنے دیجئے اپنا اُپدیش مجھے یہ خراب ہی پسند ہے"

کنور صاحب نادم سے ہو کر بولے "تم یہی لے لو۔ میں تمہارے ہی خیال سے کہتا تھا۔ میرا کیا ہے۔ میں پھر ایسا ہی شیر مار لوں گا"

دسودھا "تو مجھے حکمہ کیوں دیتے تھے؟"

کنور "حکمہ کون دیتا تھا"

دسودھا "تو کھاؤ میرے سر کی قسم کہ یہ کھال سب سے بڑھیا نہیں ہے؟"

کنور صاحب نے شکست کی ہنسی ہنس کر کہا "قسم کیوں کھائیں۔ اس ذرا سی کھال کے لئے، ایسی ایسی سو کھالیں ہوں۔ تو تمہارے سر پہ نثار کر دوں"

جب آدمی سب کھالیں لے کر چلا گیا۔ تو کنور صاحب نے کہا "میں اس کھال پر سیاہ اُون سے تمہارا نام لکھ کر تمہاری نذر کروں گا"

دسودھا تھک گئی تھی۔ پلنگ پر لیٹ کر بولی "اب میں بھی تمہارے ساتھ شکار کھیلنے جاؤں گی"

کنور صاحب مسکرانے لگے۔

(۴)

دسودھا کو شکار کی کہانیاں سننے کا چسکا سا پڑ گیا۔ اب تک کنور صاحب کی دنیا الگ تھی جس کے دُکھ سُکھ۔ نفع نقصان، بننے بگڑنے سے دسودھا کو کوئی سروکار نہ تھا۔ کنور صاحب اس دنیا کی ہر ایک بات اُس سے چھپاتے تھے۔ مگر اب دسودھا اُن کی اس دنیا میں ایک درخشاں ستارہ کی طرح طلوع ہوئی۔

ایک دن دسودھا نے کہا: "مجھے بھی بندوق چلانا سکھا دو۔"

ڈاکٹر صاحب کی اجازت ملنے میں توقف نہ ہوا۔ دسودھا تندرست ہو گئی تھی۔ کنور صاحب نے اچھی ساعت میں اسے پہلا سبق پڑھایا۔ اس دن سے جب دیکھو درختوں کے نیچے کھڑی نشانہ بازی کی مشق کر رہی ہے اور کنور صاحب ساتھ کھڑے امتحان لے رہے ہیں۔ جس دن دسودھا نے پہلا باز مارا۔ کنور صاحب مسرت سے اُچھل پڑے۔ نوکروں کو بخشش دی گئی، برہمنوں کو دان، اس خوشی کی یاد میں باز کی ممی بنوائی گئی۔

دسودھا کی زندگی میں اب ایک نئی اُمنگ، ایک نئی راحت، ایک نئی امید تھی۔ پہلے کی طرح اُس کا خالی دل اندیشوں سے نہ کانپتا تھا۔ اب اس میں حوصلہ تھا۔ قوت تھی۔ محبت تھی۔

(۵)

آخر کئی دنوں کے بعد دسودھا کی تمنا بر آئی۔ کنور صاحب اُسے ساتھ لے کر شکار کھیلنے کو رضامند ہوئے۔ اور شکار تھا شیر کا۔ شیر بھی وہ جس نے ایک مہینہ سے گردو نواح کے گاؤں میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔

چاروں طرف تاریکی تھی۔ ایسی سخت کہ زمین اُس کے بوجھ تلے کراہتی

ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں ایک بلند مچان پر بندوقیں لئے دم روکے بیٹھے تھے۔ یہ شیر نہایت خوفناک تھا۔ ابھی ایک دن پیشتر ایک سوتے ہوئے آدمی کو کھیت میں مچان پر سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ اسی شیر کی گھات میں دونوں شکاری بیٹھے تھے۔ نیچے کچھ فاصلہ پر بھینسا باندھ دیا گیا تھا۔ اور شیر کے آنے کی راہ دیکھی جا رہی تھی۔ کنور صاحب مطمئن تھے۔ مگر دسودھا کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ ذرا سا پتّا بھی ہلتا تو وہ چونک پڑتی اور بندوق سیدھی کرنے کی بجائے کنور صاحب سے چمٹ جاتی۔ کنور صاحب اس کی ہمت بندھاتے جاتے تھے "جو نہی شیر بھینسے پر آیا۔ میں اس کا کام تمام کر دوں گا۔ تمہاری گولی کی نوبت ہی نہ آنے پائے گی۔"

دسودھا نے ڈر کر کہا: "اور جو کہیں نشانہ چوک گیا تو اُچھلے گا!"

کنور: "پھر دوسری گولی چلے گی۔ تینوں بندوقیں تو بھری رکھی ہیں۔ تمہارا دل گھبراتا تو نہیں ہے؟"

دسودھا: "بالکل نہیں۔ میں تو چاہتی ہوں۔ پہلے میری بندوق چلے۔"

پتوں کی کھڑکھڑ کی آواز آئی۔ دسودھا چونک کر شوہر سے چمٹ گئی۔ کنور صاحب نے اُس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا "دل مضبوط کرو پیاری!"

دسودھا نے ندامت سے جواب دیا "نہیں نہیں میں ڈرتی نہیں ہوں ذرا چونک پڑی تھی۔"

معاً بھینسے کے پاس دو چنگاریاں سی چمک اٹھیں۔ کنور صاحب نے آہستہ سے دسودھا کا ہاتھ دبا کر اُسے شیر کے آنے کی اطلاع دی اور ہوشیار ہو گئے۔ جب شیر نزدیک آگیا۔ تو انہوں نے بندوق داغ دی۔ نشانہ خالی گیا۔ دوسرا فیر کیا۔ شیر زخمی تو ہوا مگر گرا نہیں۔ غصہ سے پاگل ہو کر اس

قدر زور سے گرجا کہ دسودھا کا کلیجہ دہل گیا۔ کنور صاحب تیسرا فیر کرنے ہی کو
تھے کہ شیر نے مچان پر جست ماری۔ اُس کے اگلے پنجوں کے دھکے سے مچان
ایسا ہلا کہ کنور صاحب بندوق لئے مچان سے نیچے گر پڑے۔ کتنا نازک موقع
تھا۔ اگر ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی تو کنور صاحب کی خیر نہ تھی۔ شیر کی جلتی ہوئی
انگارہ سی آنکھیں دسودھا کے سامنے چمک رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں کانپ
رہے تھے۔ لیکن اس خطرہ نے جیسے اُس کی نس نس میں بجلی بھر دی۔
اُس نے اپنی بندوق سنبھالی۔ شیر کے اور اُس کے درمیان دو ہاتھ سے
زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ وہ اُچک کر آیا ہی چاہتا تھا کہ دسودھا نے بندوق
چھوڑ دی۔ دھائیں! شیر کے پیچھے ڈھیلے پڑ گئے۔ نیچے گر پڑا۔ اب صورت
حال اور بھی خطرناک تھی۔ شیر سے تین چار قدم کے فاصلے پر کنور صاحب
گرے تھے۔ شاید چوٹ زیادہ آئی ہو۔ شیر میں اگر ابھی دم ہے۔ تو ضرور
اُن پر وار کرے گا۔ دسودھا کی جان آنکھوں میں تھی۔ ریوالور کلائیوں
میں۔ اُس وقت اگر کوئی اُس کے جسم میں نیزہ بھی چبھو دیتا تو اُسے
خبر نہ ہوتی۔ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ پر اس کی بیہوشی ہی اُس کی رہبر
تھی۔ اُس نے ٹارچ جلائی، دیکھا شیر اُٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری
گولی سر پر ماری اور ریوالور لئے مچان سے کود پڑی۔ شیر زور سے غرّایا۔
دسودھا نے اُس کے منہ کے سامنے ریوالور خالی کر دیا۔ کنور صاحب سنبھل
کر کھڑے ہو گئے۔ اور دوڑ کر دسودھا کو چھاتی سے لگا لیا۔ "ارے یہ
کیا؟" دسودھا بے ہوش تھی۔ خوف اس کی جان کو مٹھی میں لئے
اُس کی حفاظت کر رہا تھا۔ خوف کے ہٹتے ہی بے ہوشی اُس پر
غالب آگئی۔

(۶)

تین گھنٹوں کے بعد دسو دھا کو ہوش آیا۔ لیکن گھبراہٹ ابھی تک باقی تھی۔ اُس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کنور صاحب نے پوچھا۔ "کیوں پیاری کیا حال ہے اب؟"

دسودھا نے بیہوشی میں اپنے ہاتھوں کا حلقہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہاں سے ہٹ جاؤ۔ کہیں حملہ نہ کر بیٹھے۔"

کنور صاحب نے ہنس کر کہا۔ "شیر کب کا ٹھنڈا ہو گیا۔ برآمدہ میں پڑا ہے۔ اتنا بڑا شیر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

دسودھا۔ "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

کنور۔ "بالکل نہیں۔ تم کود کیوں پڑیں؟ پیروں میں بڑی چوٹ آئی ہوگی۔ مجھے تو تعجب ہے کہ تم بچ کیوں کر رہیں۔ اتنی بلندی سے میں کبھی کود نہ سکتا۔"

دسودھا۔ (تعجب سے) میں کہاں کودی۔ شیر مچان پر آیا اتنا یاد ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔"

کنور صاحب کو اور بھی تعجب ہوا۔ "واہ تم نے اس پر دو گولیاں چلائیں جب وہ نیچے گر پڑا تو تم بھی کود پڑیں۔ اور اُس کے منہ میں ریوالور کی گولی ٹھونس دی۔ بڑا بے حیا جانور تھا۔ اگر تم چوک جاتیں تو وہ اُٹھتے ہی مجھ پر حملہ کرتا۔ میرے پاس تو چھری بھی نہ تھی۔ بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر دوسری طرف گر گئی تھی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مجھے تم نے بچا لیا۔ ورنہ اس وقت میں یہاں کھڑا نہ ہوتا۔"

دوسرے دن وہاں سے کوچ ہوا۔

جو محل دسودھا کو پھاڑے کھاتا تھا اُس میں جا کر آج ایسی مسرت حاصل

ہوتی جیسے کسی بچھڑی ہوئی سہیلی سے ملی ہو۔ ہر ایک چیز اس کا خیر مقدم کرتی معلوم ہوتی تھی۔ جن نوکروں اور لونڈیوں سے مہینوں سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی تھی۔ اُن سے آج ہنس ہنس کر بولتی تھی۔ گویا گزشتہ سرد مہریوں کی تلافی کر رہی تھی۔

شام کا سورج آسمان کے سنہرے ساگر میں اپنی کشتی کھینتا چلا جا رہا تھا۔ وسودھا کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر سامنے کا منظر دیکھنے لگی۔ اس منظر میں آج زندگی تھی، امید تھی، ولولہ تھا۔ ملاح کا وہ سونا جھونپڑا بھی آج کتنا خوبصورت معلوم ہوتا تھا قدرت میں دلکشی بھری تھی۔

مندر کے سامنے تنبا راجکماروں کو کھلا رہی تھی۔ وسودھا کو مندر میں جا کر پوجا کرنے کا خیال آیا۔ اُس نے پوجا کا سامان منگوایا۔ اور مندر کی طرف چلی خوشی کے بھرے خزانے سے اب وہ کچھ خیرات بھی کر سکتی تھی۔ جلتے ہوئے دل سے شعلوں کے سوائے اور کیا نکل سکتا ہے۔

اتنے میں کنور صاحب آ کر بولے "اچھا پوجا کی تیاریاں ہو رہی ہیں! میں بھی وہیں جا رہا تھا۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک منت مانی تھی"۔

وسودھا نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے پوچھا "کیسی منت مانی تھی آپ نے؟"

کنور صاحب نے ہنس کر جواب دیا "یہ نہ بتاؤں گا"۔

ادیب کی عزت

صبح کے وقت حضرت قمر نے بیس دفعہ اُبالی ہوئی چائے کا پیالہ تیار کیا اور بغیر چینی اور دودھ کے پی گئے۔ یہی اُن کا ناشتہ تھا۔ دودھ اور چینی اُن کے لیے ضروریاتِ زندگی میں نہ تھیں گھر میں گئے ضرور، کہ بیوی کو جگا کر پیسے مانگیں پر اُسے پھٹے میلے لحاف میں سوتے دیکھ کر جگانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا شاید اُسے سردی کے رات بھر نیند نہ آئی ہوگی۔ اس وقت جا کر آنکھ لگی ہے کچی نیند جگا دینا مناسب نہ تھا۔ چپکے سے لوٹ گئے۔

چائے پی کر انہوں نے قلم دوات سنبھالی اور وہ کتاب لکھنے میں محو ہو گئے جو اُن کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی جس کی اشاعت اُنہیں قعرِ گمنامی سے نکال کر شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچا دے گی،

آدھ گھنٹہ کے بعد بیوی آنکھیں ملتے ہوئے آکر بولی "چائے پی چکے"

قمر نے خوش ہو کر جواب دیا "ہاں پی چکا۔ بہت اچھی بنی تھی"

"مگر دودھ اور چینی کہاں سے لائے؟"

آج کل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے ہاں کے چینی نوازوں

کی ایجاد ہے۔"

"نہ جانے آپ کو پھیکی چائے کیوں کر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے جگا کیوں نہ لیا۔ پیسے تو رکھے تھے۔"

قمر نے جواب نہ دیا۔ پھر لکھنے لگے۔ جوانی ہی میں انہیں یہ بیماری لگ گئی تھی۔ اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے۔ اس بے نیازی کی شان سے جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے۔ انہوں نے کسبِ معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گھل گیا۔ صحت گھل گئی۔ اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آ کر گھیرا۔ مگر یہ مرض لا علاج ہے۔ طلوعِ آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پجاری دنیا اور مافیہا سے بے خبر فکرِ سخن میں غرق رہتا تھا۔ پر ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مترادف ہے۔ دل تو ایک ہی تھا۔ دونوں دیویوں کو ایک ساتھ کیونکر خوش کرتے اور لکشمی کی ناراضی صرف افلاس کی شکل و صورت ہی میں نہ ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی سب سے بھیانک صورت یہ تھی کہ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر دل کھول کر داد نہ دیتے تھے۔ جیسے ساری دنیا نے ان کے خلاف سازش کر لی ہو۔ یہاں تک انہیں اپنے ادب پر مطلق اعتماد نہ تھا۔ اب انہیں یہ شبہ ہونے لگا تھا۔ کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں، اور یہ انکشاف بدرجہ غایت ہمت شکن تھا۔ یہ عمرِ عزیز یوں ہی تلف ہو گئی۔ یہ تسکین بھی نہیں کہ دنیا نے ناقدری کی ہو۔ مگر ان کا کارنامہ حیات حقیر نہیں۔ ضروریاتِ زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھیں۔ اگر کوئی تسکین تھی تو محض یہ کہ ان کی رفیقِ حیات ترک و ایثار میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سکینہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی،

قمر کو دنیا سے شکایت ہو۔ مگر سکینہ ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ اپنے نصیبوں کو رونا تو دور کی بات تھی۔ اس دیوی نے کبھی ماتھے پر بل کبھی نہ آنے دیا۔ سکینہ نے چائے کا پیالہ سمیٹتے ہوئے کہا "تو جاکر گھنٹہ آدھ گھنٹہ کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے۔ جب معلوم ہو گیا کہ جان دیکر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں تو بیکار کیوں سر کھپاتے ہو۔"

قمر نے بغیر قلم اٹھائے کہا "لکھنے میں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں۔ سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔"

"یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی جو ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں۔ تو یہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔"

"مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا۔ زیادہ تر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے۔ یا ایسے پیشوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ جن کی عوام میں عزت ہے۔ میں تو قلم کا مزدور ہوں۔ تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے۔ جنہیں کھانے کی کمی نہیں۔ انہیں ہوا کی ضرورت ہے۔ جنہیں روٹیوں کے لالے ہیں وہ ہوا کیا کھائیں گے۔ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی انہی کو ضرورت ہے۔ اس بار کو سر پہ کچھ دن اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے ضرور ہے۔"

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے اور اندر چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا۔ اس تپ کا پھل ایک دن انہیں ضرور ملے گا۔ دولت حاصل ہو یا نہ ہو۔ لیکن قمر صاحب

یاس کی اس حد تک جا پہنچے تھے۔ جہاں سے سمت مخالف میں طلوع ہونے والی امید کی سرخی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

(۳)

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ اُس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا ہے آج اُن کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناچ رہا ہے۔ سارے دن وہ اسی تخیل میں محو رہے۔ راجہ صاحب کن الفاظ میں اُن کا خیر مقدم کریں گے۔ اور وہ کن الفاظ میں اُن کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہوگی اور کن اصحاب سے اُن کا تعارف کرایا جائے گا۔ سارا دن وہ انہی خیالات کے لطف اُٹھاتے رہے۔ اس موقعہ کے لئے انہوں نے ایک نظم بھی تیار کی جس میں اُنہوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہہ دی تھی۔ سراب ہستی اُن کے زور طبع کے لئے زیادہ موزوں چیز تھی۔ مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

دوپہر ہی سے اُنہوں نے تیاریاں شروع کیں۔ حجامت بنائی صابن سے نہائے۔ سر میں تیل ڈالا۔ دقت کپڑوں کی تھی۔ مدت گزری جب انہوں نے ایک اچکن بنوائی تھی۔ اس کی حالت بھی اُن کی سی تھی۔ جیسے ذرا سی سردی یا گرمی سے انہیں زکام یا سردرد ہو جاتا تھا۔ اسی طرح وہ اچکن بھی نازک مزاج تھی۔ اُسے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر رکھا۔

سکینہ نے کہا "تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا۔ لکھ دیتے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان پھٹے حالوں جانا تو اور بھی بُرا ہے"

قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے کہا "جنہیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے۔ اُن کے جوہر دیکھتے ہیں۔ آخر کچھ

بات تو یہ ہے کہ راجہ صاحب نے مجھے مدعو کیا ہے۔ میں کوئی عہدیدار نہیں۔ زمیندار نہیں، جاگیردار نہیں، ٹھیکہ دار نہیں۔ معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اُس کی تخلیں ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے مجھے کسی شاعر کے سامنے نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔"

سکینہ اُن کی سادگی پہ ترس کھا کر بولی۔ "تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیا سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہو۔ میں کہتی ہوں راجہ صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پہ پڑتی ہے۔ سادگی ضرور اچھی چیز ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی بیوقوف ہی بن جائے۔"

قمر کو اس دلیل میں کچھ جان نظر آئی۔ اہلِ نظر کی طرح انہیں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ بولے "میرا خیال ہے چراغ جل جانے کے بعد جاؤں۔"

"میں تو کہتی ہوں۔ جاؤ ہی کیوں؟"

"اب تم کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر ایک شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھو گی "بھوک کیوں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیفہ حصّہ ہیں جو ساری دنیا میں حاضر ناظر ہے۔ جزو میں کل کی خوبیاں ہونا امر لازمی ہے۔ اس لئے جاہ و رفعت، علم و فضل کی جانب ہمارا فطرتی میلان ہے۔ میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں چونکہ دل میں ضعف ہے، اہلِ دنیا کی حشمت گیریوں کا خیال قدم قدم پر دامنگیر ہو جاتا ہے۔"

سکینہ نے گلا چھڑانے کے لئے کہا "اچھا بھئی! جاؤ۔ میں تم سے بحث نہیں کرتی۔ لیکن کل کے لئے کوئی سبیل سوچتے جاؤ۔ کیونکہ میرے پاس

صرف ایک آنہ اور رہ گیا ہے۔ جن سے قرض مل سکتا تھا۔ اُن سے لے چکی۔ اور جس سے لیا اُسے دینے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے تو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

مہتر نے ایک لمحہ کے بعد کہا۔ "دو ایک اخباروں سے روپیہ آنے والا ہے۔ شاید کل تک آجائے۔ اور اگر کل فاقہ کشی ہی کرنی پڑے تو کیا فکر ہے ہمارا فرض کام کرنا ہے۔ ہم کام کرتے ہیں۔ اور دل وجان سے کرتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود فاقہ کرنا پڑے تو میرا قصور نہیں۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ ہمارے جیسے لاکھوں آدمی آئے دن مرتے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ میں تو کبیر پنتھیوں کا قائل ہوں جو گاتے بجاتے ہوئے جنازے کو لے جاتے ہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم ہی کہو میں جو کچھ کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے امکان میں کیا ہے۔ ساری دنیا میٹھی نیند سوتی ہے اور میں قلم لئے بیٹھا ہوں۔ لوگ سیر و تفریح کرتے ہیں۔ کھیلتے کودتے ہیں۔ میرے لئے سب کچھ حرام ہے۔ یہاں تک کہ مہینوں سے ہنسنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہولی کے دن بھی میں نے تعطیل نہیں منائی۔ بیمار ہوتا ہوں۔ جب بھی لکھتا ہوں۔ سو جو تم بیمار تھیں۔ اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لئے بھی وقت نہ تھا۔ اگر دنیا نہیں قدر کرتی نہ کرے۔ اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے۔ میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ اُس کی روشنی پھیلتی ہے۔ یا اُس کے سامنے کوئی دیوار ہے۔ اُسے اُس سے مطلب نہیں۔ میرا بھی ایسا کون دوست شناسا یا رشتہ دار ہے جس کا میں شرمندہ احسان نہیں۔ یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بدنیت تصور نہیں

کرتے۔ خواہ وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کرسکیں۔ مگر انہیں مجھ سے ہمدردی ہے میری خوشی کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ آج مجھے ایک رئیس نے بلایا ہے۔"

پھر معاً اُن پر ایک نشہ چھا گیا ۔۔۔۔ غرور سے بولے "نہیں اب رات کو نہ جاؤں گا۔ میرا افلاس رسوائی کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اُس کی پردہ پوشی کرنا بے کار ہے۔ مَیں اسی وقت جاؤں گا جیسے راجہ لوگ مدعو کریں۔ وہ ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا۔ راجہ صاحب معمولی رئیس نہیں ہیں۔ وہ اسی شہر کے نہیں۔ ہندوستان بھر کے مشہور آدمی ہیں۔ اگر اب بھی کوئی مجھے معمولی آدمی سمجھے تو اس کی عقل کا قصور ہے۔"

(۱۳)

شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پرانی اچکن اور سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو گنوار اُچکے سے معلوم ہوتے تھے۔ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے آدمی ہوتے تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی۔ توند بھی بجائے خود ایک بارعب شئے ہے۔ مگر ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں۔ اوج نہیں۔ دل نہیں، پھر بھی اکڑے جاتے تھے۔ ایک ایک عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

یوں گھر سے نکل کر وہ دکانداروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے۔ مگر آج وہ گردن اُٹھائے اُن کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ ان کے تقاضوں کا دندان شکن جواب دینے کو تیار تھے۔ مگر شام کا وقت تھا۔ ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ کوئی اُن کی طرف

نہیں دیکھتا جس رقم کو بہت زیادہ سمجھے تھے۔ وہ دکانداروں کی نگاہوں میں معمولی تھی۔ کم از کم ایسی نہ تھی۔ جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اتار کر رکھ دیں۔ حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا۔ پر جی نہ بھرا۔ تب دوسرا چکر لگایا۔ اس سے بھی کچھ نہ بنا۔ تب وہ خود حافظ صمد کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ حافظ صاحب لبا دلی کا کام کرتے تھے۔ بہت دن ہوئے قمر کو دیکھ کر بولے "واہ حضرت! ابھی تک چھاپنے کے دام نہیں ملے۔ ایسے سو پچاس گاہک مل جائیں۔ تو دیوالہ نکل جائے۔ اب تو دن بہت ہو گئے"

حضرت قمر کی باچھیں کھل گئیں۔ دل کی مراد پوری ہوئی۔ بولے "میں بھولا نہیں ہوں حافظ صاحب! ان دنوں کام کی اس قدر زیادتی رہی کہ گھر سے نکلنا دشوار تھا۔ روپیہ تو ہاتھ نہیں آتا۔ پر آپ کی دعا سے قدر شناسوں کی کمی نہیں ہے۔ دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے ہیں۔ زندگی وبال ہے"

اس وقت بھی راجہ صاحب ——————— اجی وہی جو نکڑ کے والے بنگلے میں رہتے ہیں۔ انہیں کے یہاں جا رہا ہوں۔ روز کوئی نہ کوئی ایسا ہی موقعہ آتا رہتا ہے"

حافظ صاحب مرعوب ہو گئے۔ "اچھا آپ راجہ صاحب کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے آپ جیسے باکمالوں کی قدر رئیس ہی کر سکتے ہیں۔ اور کون کرے گا۔ سبحان اللہ! آپ اس وقت یکتا ہیں۔ اگر کوئی موقعہ ہاتھ آئے تو غریب کو بھول نہ جائیے گا۔ راجہ صاحب کی اگر ادھر نگاہ ہو جائے تو پھر کیا پوچھنا۔ ایک پورا لباداڑا تو انہی کے

لئے درکار ہے۔ ڈھائی تین لاکھ سالانہ کی آمدنی ہے۔"

قمر کو ڈھائی تین لاکھ کی آمدنی حقیر سی معلوم ہوئی۔ زبانی جمع خرچ ہے تو بیس لاکھ کہتے ہیں کیا حرج ہے۔ بولے "ڈھائی تین لاکھ آپ تو انہیں گالیاں دیتے ہیں۔ اُن کی آمدنی دس لاکھ سے کم نہیں۔ ایک صاحب کا اندازہ تو بیس لاکھ کا ہے۔ مکان ہیں۔ دُکانیں ہیں۔ ٹھیکہ ہے۔ امانتی روپے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرکار بہادر کی نگاہ ہے۔"

حافظ نے بڑے عجز سے کہا "یہ دُکان آپ کی ہے جناب۔ بس اتنی ہی عرض ہے۔ اے مرادی! ذرا دو پیسے کے اچھے پان تو بنوا لا آپ کے لئے۔ آیئے دو منٹ بیٹھئے۔ کوئی چیز دکھاؤں گا۔ آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔"

قمر نے پان کھاتے ہوئے کہا "اس وقت تو معاف رکھئے۔ وہاں دیر ہوگی۔ پھر کبھی حاضر ہوں گا۔"

یہاں سے اُٹھ کر وہ ایک کپڑے والے کی دکان پر رُکے۔ منوہر داس نام تھا۔ اُنہیں دیکھ کر آنکھیں اٹھائیں۔ بیچارا اُن کے نام کو رو بیٹھا تھا۔ سوچتا تھا شاید کہیں چلے گئے۔ سمجھا روپے دینے آئے ہیں۔ بولا "بھائی! آپ نے تو بہت دنوں سے درشن ہی نہیں دیئے۔ کئی بار رقعہ بھیجا مگر آدمی کو آپ کے مکان کا ہی پتہ نہ ملا۔ منیم جی ذرا دیکھو تو، آپ کے نام کیا نکلتا ہے؟"

قمر کی روح تقاضوں سے کانپتی تھی۔ لیکن آج اس طرح بےفکر کھڑے تھے۔ جیسے کوئی آہنی خود پہن لیا ہو۔ جس پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔ بولے "ذرا راجہ صاحب کے یہاں ہو آؤں تو بےفکر ہو بیٹھوں۔ اس وقت وقت نہیں۔ جلدی میں ہوں۔"

راجہ صاحب پر منوہر داس کے کئی ہزار روپے نکلتے تھے۔ پھر بھی ان

کا دامن نہ چھوڑتا تھا۔ ایک کے تین وصول کرتا۔ اس نے قمر کو بھی اسی جماعت میں رکھ لیا جس کا پیشہ رئیسوں کو لوٹنا ہے۔ بولا "ہاں تو کھاتے جائیے جناب راجہ صاحب ایک دن کے ہیں ہم تو بارہ مہینوں کے ہیں۔ کچھ کپڑا درکار ہو تو لے جائیے۔ عید آرہی ہے۔ موقعہ ملے تو راجہ صاحب کے خزانچی سے کہنا، پرانا حساب بہت دنوں سے پڑا ہوا ہے، اب تو صاف ہو جائے۔ اب ہم ایسا کونسا نفع لے لیتے ہیں کہ دو دو سال تک حساب ہی نہ ہو"

قمر بولے "اس وقت تو یہاں رہنے دو بھائی دیر ہو جائے گی۔ جب اُنہیں مجھ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے۔ اور میرا اتنا ادب کرتے ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ انہیں تکلیف نہ ہونے دوں۔ ہم تو قدر دانی چاہتے ہیں۔ دولت کے بھوکے نہیں۔ کوئی ہمیں چاہے تو ہم اُس کے غلام ہیں۔ کسی کو ریاست کا غرور ہے تو ہمیں بھی اپنے علم و کمال کا غرور ہے۔

(۴)

حضرت قمر راجہ صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو دیئے جل چکے تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی موٹریں کھڑی تھیں۔ دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے تھے۔ ایک صاحب مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ قمر کو دیکھ کر وہ جھجکے، پھر اُنہیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولے "آپ کے پاس کارڈ ہے" قمر صاحب کی جیب میں تھا۔ مگر اس مطالبے پر انہیں غصہ آگیا۔ انہی سے کیوں کارڈ مانگا گیا۔ اوروں سے تو کوئی پوچھتا نہیں۔ بولے "میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں۔ اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا، ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ راجہ صاحب سے کہہ دیجئے گا۔ قمر آیا تھا لوٹ گیا" وہ صاحب بولے "نہیں نہیں جناب! اندر چلئے آپ

سے تعارف نہ تھا۔ معاف فرمائیے۔ آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے۔ خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللہ!"

اُس شخص نے قمر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اس نے جو کچھ کہا، وہ ہر ایک مصنّف ہر ایک شاعر کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی ادیب اس داد سے مستغنی نہیں۔ قمر اندر پہنچے۔ تو دیکھا کہ بارہ دری کے سامنے وسیع اور آراستہ احاطہ میں بجلی کے لیمپ روشن ہیں۔ وسط میں ایک حوض ہے اور حوض میں سنگ مرمر کی ایک پری۔ پری کے سر پر فوارہ۔ فوارے کی پھواریں رنگین۔ لیمپوں سے رنگین ہو کر ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے قوس قزح پگھل کر برس رہا ہو۔ حوض کے چاروں طرف میزیں لگی تھیں میزوں پر سفید میز پوش۔ ان پر خوبصورت گلدستے۔

قمر کو دیکھتے ہی راجہ صاحب نے خیر مقدم کیا "آئیے آئیے۔ اب کے انیس ہند میں آپ کی نظم دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا اس شہر میں آپ جیسے رتن بھی چھپے ہوئے ہیں"

پھر بیٹھے ہوئے احباب سے اُن کا تعارف کرانے لگے۔ "آپ نے حضرت قمر کا نام تو سُنا ہوگا؟ وہ آپ ہی ہیں۔ کیا شیرینی ہے، کیا جدت ہے کیا تخیل ہے، کیا روانی ہے، کیا ندرت ہے کہ واہ واہ! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کر ناچنے لگتا ہے"

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے۔ قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا وہ چڑیا گھر کا کوئی جانور ہو۔ اور بولے "آپ نے انگریزی شاعری کا کبھی مطالعہ کیا؟ بائرن۔ شیلے۔ ٹینسن وغیرہ"

قمر نے بے اعتنائی سے جواب دیا "جی ہاں، تھوڑا بہت دیکھا ہے"

"آپ اُن اُستادانِ فن کی کتابوں میں سے کسی کا ترجمہ کردیں۔ تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں۔"

قمر نے آپ کو بائرن شیلے سے جو بہر کم تر سمجھتے تھے۔ بولے "ہمارے یہاں روحانیت کا ابھی اتنا فقدان نہیں ہے کہ ہم مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔ میرا خیال ہے کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔"

انگریزی پوش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا۔ راجہ صاحب نے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں، ذرا موقعہ ومحل دیکھ کر باتیں کرو۔ اور بولے "انگریزی لٹریچر کا کیا کہنا، شاعری میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔"

انگریزی پوش "ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ شاعری کسے کہتے ہیں۔ وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا منتہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔"

قمر نے اس بات کا جواب تنفر سے دیا "میرا خیال ہے۔ آپ نے ہندوستانی شعراء کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں ہے۔"

راجہ صاحب نے قمر کا منہ بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ بولے "آپ مسٹر پراچے ہیں۔ آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اور لوگ انہیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔"

اس کے معنی یہ تھے کہ اب آپ زیادہ نہ بکیے۔ غریب قمر کو پراچے کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ ایک اور دیسی صاحب آگئے۔ راجہ صاحب نے تپاک سے اُن کا بھی استقبال کیا۔ "آیئے ڈاکٹر چڈھا مزاج تو اچھے ہیں۔"

چڈھا صاحب نے راجہ صاحب سے ہاتھ ملایا۔ اور قمر کی طرف دیکھ

کر بولے "آپ کی تعریف؟"

راجہ صاحب نے قمر کا تعارف کرایا "آپ حضرت قمر شاعر ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا "اچھا آپ شاعر ہیں اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے۔"

یہ تماشا کئی مرتبہ ہوا، اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی۔ "اچھا آپ شاعر ہیں؟" یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر نیا صدمہ پہنچاتے تھے۔ اُن کا باطنی مفہوم قمر سے چھپا نہ تھا، ان کا عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا، تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو پکاؤ، یہاں تمہارا کیا کام؟ تمہارا اتنا حوصلہ کہ اس محفل میں چلے آؤ۔ قمر اپنے اوپر جھنجھلا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پاکر وہ پھولے نہ سماتے تھے لیکن یہاں آکر اُن کی جس قدر تذلیل ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی "تمہارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم خود اس عقلمند دنیا میں کسی کے کام نہیں آسکتے۔ وکیل، بیرسٹر تمہارا احترام کیوں کریں۔ تم ان کے موکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم تمہاری طرف کیوں دیکھیں۔ انہیں بغیر فیس کے تمہارے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم لکھنے کے لئے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ۔ بس دنیا میں تمہارا اور کوئی مصرف نہیں۔"

یکایک لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔ آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز میں تھا وہ آگئے۔ یہ صاحب یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔ راجہ صاحب نے لپک کر اُن سے ہاتھ ملایا اور آکر قمر سے بولے "آپ اپنی نظم تو لکھ ہی لائے ہوں گے؟"

قمر نے جواب دیا "میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی۔"

"سچ! تب تو آپ نے غضب ہی کر ڈالا۔ ارے پہلے آدمی اب ہی بیٹھ کر کوئی چیز لکھ لو، دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ ایسے موقعہ پر ایک آدھ نظم کا پڑھا جانا لازمی ہے"

"میں اس قدر جلدی کوئی چیز نہیں لکھ سکتا"

"میں نے بیکار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا"

"بالکل بیکار"

"ارے بھائی جان! کسی پرانے شاعر ہی کی کوئی چیز سنا دیجئے۔ یہاں کون جانتا ہے"

"جی نہیں معاف فرمایئے میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں"

یہ کہتے کہتے حضرت قمر وہاں سے چل دیئے۔ گھر پہنچے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا "اتنی جلدی کیونکر چلے آئے؟"

"میری وہاں ضرورت نہ تھی"

"چہرہ کھلا ہوا ہے۔ خوب عزت افزائی ہوئی ہوگی"

"ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی"

"خوب خوش ہو رہے ہو"

اس لئے کہ آج مجھے ہمیشہ کے لئے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں اور جلنے کے لئے بنا ہوں۔ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا۔ میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لئے جنت ہے۔ میں نے آج سمجھ لیا کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے"

قاتل

جاڑوں کی رات تھی، دس بجے ہی سڑکیں بند ہو گئی تھیں، اور گلیوں میں سناٹا تھا۔ بوڑھی بیوہ ماں نے اپنے نوجوان بیٹے دھرم ویر کے سامنے تھالی پروستے ہوئے کہا "تم رات تک کہاں رہتے ہو۔ بیٹا رکھے رکھے کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف سوتا پڑ گیا۔ آگ بھی تو اتنی نہیں رہتی کہ اتنی رات تک بیٹھی تاپتی رہوں"

دھرم ویر شکیل، توانا نوجوان تھا۔ تھالی کھینچتا ہوا بولا "ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔ اماں! یہاں کے مردہ دل آدمی سرِ شام ہی سے سو جائیں تو کوئی کیا کرے۔ یورپ میں لوگ بارہ ایک بجے رات تک سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کے لطف اٹھانا کوئی ان سے سیکھے۔ ایک بجے سے پہلے تو کوئی سوتا ہی نہیں"

ماں نے پوچھا "تو آٹھ دس بجے سو کر اٹھتے بھی ہوں گے"

دھرم ویر نے پہلو بچا کر کہا "نہیں اٹھتے، وہ چھ بجے ہی اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہم لوگ بہت سونے کے عادی ہیں۔ دس سے چھ تک آٹھ گھنٹے ہوتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے آدمی سوئے تو کام کیا کرے گا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ آدمی کو آٹھ گھنٹے سونا چاہیے۔ انسان جتنا کم سوئے اتنا ہی اچھا۔ ہماری سبھا نے اپنے دستور العمل میں داخل کر لیا ہے کہ اس کے ممبروں کو تین گھنٹے

سے زیادہ نہ سونا چاہیئے"

ماں اس سبھا کا ذکر سنتے سنتے تنگ آگئی تھی "یہ نہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ یہ نہ پہنو، وہ نہ پہنو، نہ بیاہ کرو نہ شادی کرو، نہ نوکری کرو، نہ چاکری کرو۔ یہ سبھا کیا آدمیوں کو سنیاسی بنا کر چھوڑے گی۔ اتنا تیاگ تو سنیاسی ہی کر سکتا ہے۔ تیاگی سنیاسی بھی تو نہیں ملتے۔ ان میں بھی زیادہ نفس کے بندے، نام کے تیاگی ہیں، آج سونے کی قید بھی لگا دی۔ ابھی تین مہینے کی سیاحت ختم ہوئی ہے۔ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے ہیں اب بارہ بجے کھا۔ بیٹے یا کون جانے رات کو کھانا ہی اڑا دیں۔ اعتراض کے لہجہ میں بولی "جب ہی یہ صورت نکل آئی ہے کہ چاہو تو ایک ایک ہڈی گن لو۔ آخر سبھا والے کوئی کام بھی کرتے ہیں یا محض آدمیوں پر قیدیں ہی لگایا کرتے ہیں؟"

دھرم ویر بولا "جو کام تم کرتی ہو۔ وہی ہم کرتے ہیں۔ تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔ ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے"

بوڑھی بیوہ جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی۔ دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہو گئی، اور جیل ہی میں راہی عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عفت آمیز خلوص اور انہماک سے خدمت قوم میں مصروف تھی۔ شروع میں اس کا نوجوان فرزند بھی رضاکاروں میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر ادھر پانچ مہینوں سے وہ اس نئی سبھا میں شریک ہو گیا تھا۔ اور اس کے سرگرم کارکنوں میں سمجھا جاتا تھا۔

ماں نے مشتبہ انداز سے پوچھا "تو تمہاری سبھا کا بھی کوئی دفتر ہے؟"

"ہاں ہے"

"اس میں کتنے ممبر ہیں؟"

ابھی تو صرف پچیس ممبر ہیں۔ لیکن وہ پچیس آدمی جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ تمہارے پچیس ہزار بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو اماں کسی سے کہنا مت۔ ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آئے گی۔ مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے۔ یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا صریح اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں نہیں آزاد ہوا کرتیں۔ یہاں کے لوگ اپنی عقل سے کام لیتے نہیں۔ ایک آدمی نے کہا۔ یوں سوراجیہ مل جائیگا بس آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ آدمی گمراہ ہے۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ دل میں اس خیال سے خوش ہو لیں کہ ہم آزادی کے قریب آتے جاتے ہیں۔ مگر مجھے تو یہ طرز عمل بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کے رونے دھونے اور مچلنے پر کھلونے اور مٹھائیاں ملا کرتی ہیں۔ وہی ان لوگوں کو مل جائے گا۔ اصلی چیز جب ہی ملیگی، جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے"

ماں نے کہا "اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے لاکھوں آدمی جیل نہیں گئے۔ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے۔ ہم نے اپنی جائدادیں نہیں ضبط کرائیں"

دھرم ویر "اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا۔ وہ ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے، جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ اب ہم یہاں ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایکہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں تو آج سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ بھی اسی طرح

آزاد ہوا۔ اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔ اور کوئی طریقہ نہیں ہے ہمیں۔ ان کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے اس پر جتنا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں۔"

ماں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اسے بیوہ ہوئے دس سال ہو گئے تھے۔ یہی لڑکا اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ اسی کو سینے سے لگائے محنت مزدوری کر کے اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے۔ اس خیال سے خوش تھی کہ یہ چار پیسے کمائے گا۔ گھر میں بہو آ جائے گی، ایک ٹکڑا کھاؤں گی، اور پڑی رہوں گی۔ آرزوؤں کے پتلے پتلے تنکوں سے اس نے ایک کشتی بنائی تھی۔ اور اسی پر بیٹھ کر زندگی کے دریا کو پار کر رہی تھی۔ وہ کشتی اب اسے لہروں میں جھکولے کھاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کشتی دریا میں ڈوبی جا رہی ہے۔ اس نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیٹا تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو انگریزوں کو قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائیں گے۔ ہم انگریزوں کے دشمن نہیں۔ ہم اس طرز حکومت کے دشمن ہیں۔ اگر یہ طرز حکومت ہمارے بھائی ہندوؤں ہی کے ہاتھوں میں ہو اور اس کا بہت بڑا حصہ ہے بھی۔ تو ہم اس کی بھی اسی طرح مخالفت کریں گے۔ روس میں تو کوئی دوسری قوم راج نہ کرتی تھی۔ پھر روس والوں نے اس حکومت کو اکھاڑ پھینکا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ زار رعایا کی پروا نہ کرتا تھا۔ امراء مزے اڑاتے تھے۔ غریبوں کو پیسا جاتا تھا۔ یہ باتیں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ وہی حال ہمارا ہے۔ یہاں ایک ایک عہدیدار ایک ہزار غریبوں کا حصہ کھا جاتا ہے۔ ملک کی دولت ایک نہ ایک بہانے سے نکلی چلی جاتی ہے اور ہم غریب ہوتے جاتے ہیں۔ ہم اس غیر آئینی حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ میں

تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ اس سبھا سے اپنا نام کٹوا لو۔ خواہ آگ میں نہ کودو۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ کہ تم عدالت میں خون کے جرم میں لائے جاؤ۔"

دھرم ویر پر اس منت آمیز التجا کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا "اس کا کوئی خوف نہیں، ہم نے اس کے متعلق بہت کافی احتیاط کر لی ہے۔ گرفتار ہونا تو حماقت میں داخل ہے۔ ہم لوگ اس حکمت سے کام کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی گرفتار نہ ہو۔"

ماں کے چہرے پر اب خوف کی جگہ شرمندگی کی جھلک نظر آئی، بولی، "یہ تو اس سے بھی بدتر ہے۔ بے گناہ سزا پائیں اور قاتل چین سے بیٹھے رہیں۔ یہ شرمناک ہے۔ میں اسے کمینہ پن سمجھتی ہوں۔ کسی کو چھپ کر قتل کرنا دغا بازی ہے، مگر اپنے عوض اپنے بے گناہ بھائیوں کو پھنسا دینا قوم فروشی ہے، ان بے گناہوں کا خون بھی قاتل کی گردن پر ہوگا۔"

دھرم ویر نے اپنی ماں کی پریشانی کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اماں تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں، تم اپنے دھرنے دیئے جاؤ، جلوس نکالے جاؤ، ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہمیں کرنے دو، گناہ اور ثواب، پاپ اور پن، دھرم اور ادھرم یہ بے معنی الفاظ ہیں۔ جس کام کو تم گناہ سمجھتی ہو اسے میں نیک ثواب سمجھتا ہوں۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ نسبتی الفاظ ہیں۔ تم نے بھگوت گیتا تو پڑھی ہے۔ کرشن بھگوان نے صاف کہا ہے، مارنے والا میں ہوں، جلانے والا میں ہوں۔ آدمی نہ کسی کو مار سکتا ہے نہ جلا سکتا ہے، پھر کہاں رہا تمہارا گناہ؟ مجھے اس بات کی کیوں شرم ہو کہ میرے عوض کوئی دوسرا مجرم قرار دیا گیا۔ یہ انفرادی جنگ نہیں ہے، انگلینڈ کی مجموعی طاقت سے جنگ ہے

میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے، اس میں کوئی فرق نہیں، جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہو اُسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔"

ماں حیرت سے لڑکے کا منہ دیکھنے لگی، اس سے مباحثہ کرنا بیہودہ تھا۔ اپنی دلیلوں سے وہ اُسے قائل نہ کر سکتی تھی۔ دھرم ویر کھانا کھا کر اٹھ گیا۔ مگر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ اُس نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ کسی کو قتل کر آیا ہو یا قتل کرنے جا رہا ہو۔ اس خیال سے اُس کے جسم میں رعشہ آگیا۔ عام آدمیوں کی طرح قتل اور خون کی نفرت اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں بھری ہوتی تھی، اس کا اپنا فرزند قتل کا مرتکب ہو، اس سے زیادہ شرم، ذلت، حقارت اس کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ قومی خدمت کے اس معیار پر جان دیتی تھی۔ جو تیاگ، بے نفسی، خلوص اور صاف دلی کی برکت ہے۔ اس کی نگاہ میں قوم کا خادم وہ تھا۔ جو حقیر ترین مخلوق کا دل کبھی نہ دُکھائے، بلکہ ضرورت پڑنے پر خوشی سے اپنے کو قربان کر دے۔ اہنسا اس کے اخلاق احساسات کا جزو اعظم تھی۔ اگر دھرم ویر کسی غریب کی حمایت میں گولی کا نشانہ بن جاتا۔ تو وہ روتی تو ضرور۔ مگر گردن اٹھا کر۔ اُسے روحانی صدمہ ہوتا۔ شاید اس صدمہ سے جانبر نہ ہوتی۔ مگر اُس صدمہ میں غرور کا صدمہ شامل ہوتا۔ لیکن وہ کسی کا خون کر آئے۔ یہ عذاب قہر تھا، لعنت تھی۔ لڑکے کو کیسے روکے؟ یہی سوال اس کے سامنے تھا۔ وہ یہ نوبت ہرگز نہ آنے دیگی کہ اُس کا فرزند خون کے جُرم میں گرفتار ہو۔ نہ اُسے یہی برداشت تھی۔ کہ اُس کے جُرم کی سزا بے گناہوں کو ملے۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا۔ لڑکے میں یہ شوریدہ سری آئی۔ کیونکر؟ وہ کھانا کھانے بیٹھی، لقمہ حلق میں نہ جا سکتا۔ کوئی ظالم ہاتھ دھرم ویر کو اس کی گود سے چھینے لیتا ہے، وہ اس

ہاتھ کو ہٹا دینا چاہتی تھی، اپنے لختِ جگر کو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی جُدا نہ کرے گی۔ سایہ کی طرح اس کے پیچھے رہے گی۔ کس کی مجال ہے، جو اس کے لڑکے کو اس کی گود سے چھینے، دھرم ویر باہر کے کمرہ میں سویا کرتا تھا۔ اُسے گمان ہُوا وہ کہیں چلا نہ گیا ہو، فوراً اس کے کمرہ میں آئی، دھرم ویر کے سامنے چراغدان پر چراغ جل رہا تھا۔ وہ ایک کتاب کھولے پڑھتا پڑھتا سو گیا تھا، کتاب اس کے سینے پر پڑی ہوئی تھی۔ اماں نے وہیں بیٹھ کر بیکسانہ خلوص اور انکسار کے ساتھ پرماتما سے اس کی "تالیفِ قلب" کے لئے دُعا کی۔ اُس کے چہرہ پر اب بھی وہی بھولا پن، وہی معصومیت تھی۔ جو پندرہ بیس سال پہلے نظر آتی تھی۔ تندی یا کرختگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ ماں کی اصول پروری ایک لمحے کے لئے ماتا کے دامن میں چھپ گئی۔ ماں نے دل سے بیٹے کے دلی جذبات کو دیکھا۔ اس نوجوان کے دل میں خدمت کا کتنا جوش ہے۔ قوم کا کتنا درد ہے۔ مظلومی سے کتنی ہمدردی ہے۔ اگر اس میں بوڑھوں کی مصلحت اندیشی صبر، آہستہ روی ہے، تو اس کی کیا وجہ ہے۔ جو شخص جان جیسی عزیز چیز کو قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اس کی تڑپ اور جلن کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ کاش یہ جوش، یہ درد ہنسا کے پنجہ سے نکل سکتا تو بیداری کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی۔

ماں کی آہٹ پا کر دھرم ویر چونک پڑا اور کتاب سنبھالتا ہُوا بولا "تم کب آگئیں اماں! مجھے تو نہ جانے کب نیند آگئی"

ماں نے چراغدان کو دُور ہٹا کر کہا "چارپائی کے پاس چراغ رکھ کر نہ سویا کرو۔ اس سے کبھی کبھی حادثے ہو جایا کرتے ہیں اور کیا ساری رات

پڑھتے ہی رہ گئے۔ آدھی رات تو ہو گئی، آرام سے سو تو میں بھی یہیں لیٹی جاتی
ہوں۔ مجھے اندر نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے"

دھرم ویر: "تو میں ایک چارپائی لا کر ڈالے دیتا ہوں"

"نہیں، میں یہیں زمین پر لیٹی جاتی ہوں"

"واہ میں چارپائی پر لیٹوں گا۔ اور تم زمین پر پڑی رہو گی۔ تم چارپائی
پر آجاؤ"

"بھلا میں چارپائی پر لیٹوں اور تو زمین پر پڑا رہے یہ تو نہیں ہو سکتا"

"میں چارپائی لئے آتا ہوں۔ نہیں میں بھی اندر ہی لیٹتا ہوں۔ آج
آپ ڈریں کیوں؟"

تمہاری باتوں نے ڈرا دیا۔ اور کیا مجھے بھی کیوں اپنی سبھا میں نہیں
شریک کر لیتا"

دھرم ویر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بستر اور چارپائی اٹھا کر اندر والے
کمرہ میں لے چلا۔ ماں آگے آگے چراغ دکھاتی ہوئی چلی۔ کمرہ میں چارپائی
ڈال کر اس پر لیٹتا ہوا بولا: "اگر تم میری سبھا میں شریک ہو جاؤ۔ تو کیا
پوچھنا بچارے کچی کچی روٹیاں کھا کر بیمار ہو رہے تھے۔ انہیں اچھا کھانا
ملنے لگیگا۔ پھر ایسی کتنی ہی باتیں ہیں جنہیں ایک بوڑھی عورت جتنی آسانی
سے کر سکتی ہے۔ نوجوان ہرگز نہیں کر سکتے۔ مثلاً کسی سبھا کا سراغ لگانا۔
عورتوں میں ہمارے خیالات کی اشاعت کرنا۔ مگر تم مذاق کر رہی ہو"

ماں نے متانت سے کہا: "نہیں بیٹا! مذاق نہیں کر رہی — دل
سے کہہ رہی ہوں، ماں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے، اس کا اندازہ تم نہیں
کر سکتے۔ تمہیں اتنے بڑے خطرے میں تنہا چھوڑ کر میں گھر میں نہیں بیٹھ

سکتی جب تک مجھے کچھ نہ معلوم تھا۔ دوسری بات تھی لیکن اب یہ حالات جان لینے کے بعد میں تم سے علیحدہ نہیں رہ سکتی ہیں۔ ہمیشہ تمہارے پہلو میں رہوں گی۔ اور اگر کوئی ایسا موقعہ آیا تو تم سے پہلے میں اپنے تئیں قربان کر دونگی مرتے وقت تم میرے سامنے ہو گے۔ میرے لئے یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں نازک موقعوں پر ڈر جاؤں گی یا چیخوں چلاؤں گی ہرگز نہیں۔ سخت سے سخت خطروں کے سامنے بھی تم میری زبان سے ایک چیخ نہ سنو گے۔ اپنے بچے کی حفاظت کے لئے گائے بھی شیرنی بن جاتی ہے۔"

دھرم دیو نے عقیدت سے سرشار ہو کر ماں کے قدموں کا بوسہ لے لیا۔ اس کی نگاہوں میں وہ کبھی اتنی تعظیم اور محبت کے قابل نہ تھی۔

(۳)

دوسرے ہی دن آزمائش کا موقعہ درپیش ہوا۔ یہ دو دن بڑھیا نے ریوالور کی مشق میں صرف کئے۔ پٹاخے کی آواز پر کانوں پر ہاتھ رکھنے والی اہنسا اور دھرم کی دیوی اتنی دلیری سے ریوالور چلاتی تھی، اس کا نشانہ اتنا بے خطا ہوتا تھا کہ سبھا کے نوجوانوں کو بھی حیرت ہوتی تھی۔

پولیس کے افسر اعلیٰ کے نام موت کا پروانہ نکلا۔ اور یہ خدمت دھرم دیو کے سپرد ہوئی۔

دونوں گھر پہنچے تو ماں نے پوچھا "کیوں بیٹا! اس افسر نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ پھر سبھا نے کیوں اس کا انتخاب کیا؟"

دھرم دیو ماں کی سادگی پر مسکرا کر بولا "تم سمجھتی ہو کہ ہمارے کانسٹیبل اور سب انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ جو کچھ کرتے ہیں، اپنی خوشی سے کرتے

ہیں؟ وہ لوگ جتنے مظالم کرتے تھے۔ اُن کے لئے یہی شخص ذمہ دار ہے، اور پھر ہمارے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ یہ اس مشین کا ایک خاص پُرزہ ہے جو ہماری قوم کو انتہائی بے رحمی سے پامال کر رہی ہے، لڑائی میں ذاتیات سے کوئی سروکار نہیں وہاں تو مخالف فریق کا ممبر ہونا ہی سب سے بڑا گناہ ہے"

ماں خاموش ہوگئی۔ ایک لمحہ کے بعد ڈرتے ڈرتے بولی۔ "بیٹا میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ اب ایک سوال کرتی ہوں۔ اُسے پورا کرو گے؟"

دھرم ویر نے کہا "یہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اماں تم جانتی ہو، میں تمہارے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا"

ماں۔ "ہاں بیٹا! یہ جانتی ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے یہ سوال کرنے کی جرأت ہوئی۔ تم اس سبھا سے الگ ہو جاؤ۔ دیکھو تمہاری بوڑھی ماں ہاتھ باندھ کر تم سے یہ عرض کر رہی ہے"

ماں ہاتھ باندھ کر سائلانہ انداز سے بیٹے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

دھرم ویر نے قہقہہ مار کر کہا "یہ تو تم نے بیڈھب سوال کیا اماں۔ تم جانتی ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ زندہ لوٹ کر نہ آؤں گا۔ اگر یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں تو بھی جان نہیں بچ سکتی۔ سبھا کے سب ممبر ہی میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ اور مجھے اُن کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑے گا۔ تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے، اسے تمہارے قدموں پر نثار کر سکتا ہوں۔ لیکن مادرِ وطن نے تمہیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے۔ اور اس کا حق افضل ہے اگر کوئی ایسا موقعہ ہاتھ آجائے کہ مجھے مادرِ وطن کی حمایت کے لئے تمہیں قتل کرنا پڑے تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منہ نہ موڑ سکوں گا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے۔ لیکن تلوار تمہاری گردن پر ہوگی۔ ہمارے

مذہب میں قوم کے مقابلہ میں کسی چیز کی حقیقت نہیں ۔ اس لئے سبھا کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے ۔ ہاں تمہیں خوف ہو تم میرے ساتھ نہ جاؤ ۔ میں کوئی بہانہ کر دونگا ، اور کسی دوسرے کامریڈ کو ساتھ لے لوں گا ۔ اگر تمہارے دل میں ضعف ہو تو مجھے فوراً بتلا دو ۔"

ماں نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا " میں نے تمہارے خیال سے کہا تھا ۔ بھیا! ورنہ مجھے کیا خوف !"

تاریک شب کے پردہ میں اس مہم کو انجام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا ۔ معتوب رات کو کلب سے جس وقت لوٹے ، وہیں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے ۔ دھرم ویر نے دوپہر ہی کو موقعہ کا معائنہ کر لیا ۔ اس خاص مقام کا انتخاب کر لیا ۔ جہاں سے وہ نشانہ مارے گا ۔ صاحب کے بنگلہ کے قریب کریل اور کروندے کی ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی ، وہی اس کی کمین گاہ ہوگی ۔ جھاڑی کے بائیں جانب نشیب تھا ۔ نشیب میں بیر اور امرود کے باغ تھے ۔ بھاگ نکلنے کا اچھا موقعہ تھا ۔

صاحب کے کلب جانے کا وقت سات اور آٹھ بجے کے درمیان تھا لوٹنے کا وقت گیارہ یا بارہ بجے تھا ۔ ان اوقات کی تحقیق کر لی گئی تھی ۔ دھرم ویر نے طے کیا کہ نو بجے چل کر اسی کروندے والی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ جائیں ۔ وہیں ایک موڑ بھی تھا ۔ موڑ پر موٹر کی رفتار کچھ سست ہو جائیگی ۔ عین اسی وقت اُسے ریوالور کا نشانہ بنا لیا جائے ۔

جوں جوں دن گزرتا جاتا تھا ۔ بوڑھی ماں کا دل دہشت سے خشک ہوتا جاتا تھا ۔ دھرم ویر کے معمول میں مطلق فرق نہ تھا ۔ وہ معین وقت پر اُٹھا ، ناشتہ کیا ۔ سندھیا کی حسب معمول کچھ دیر پڑھتا رہا ۔ دو چار احباب آگئے

اُن کے ساتھ دو تین بازیاں شطرنج کی کھیلیں۔ اطمینان سے کھانا کھایا۔ اور معمول سے کچھ زیادہ، پھر آرام سے سویا۔ گویا اُسے کوئی غم نہیں ہے، ماں کا دل اُچاٹ تھا، کھانے پینے کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ من مار کر ایک جگہ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ پڑوس کی عورتیں حسب معمول آئیں۔ وہ کسی سے مخاطب نہیں ہوئی ایک سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ گویا چوہیا بلی کے خوف سے کوئی سوراخ ڈھونڈتی ہو۔ کوئی پہاڑ سا اس کے سر پر گرتا تھا۔ اس سے کہیں نجات نہیں، کہیں مفر نہیں، وہ رسمی فلسفہ جس سے اب تک اُسے تسکین ہوتی تھی۔ تقدیر۔ پُنر جنم۔ مشیّت اس بلائے مہیب کے سامنے بیکار سے معلوم ہوتے تھے۔ زرہ بکتر اور خود تیر اور تفنگ سے حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن پہاڑ تو اسے ان سارے دفاعی آلات کے ساتھ کچل ڈالے گا۔ اس کے دل و دماغ مفلوج ہوتے جاتے تھے۔ اگر کوئی احساس تھا۔ تو وہ دہشت کا۔ مگر شام ہوتے ہوتے اس کے دل پر ایک سکون کی حالت طاری ہوئی۔ اُس کے اندر ایک طاقت پیدا ہوئی۔ جسے مجبوری کی طاقت کہہ سکتے ہیں۔ چڑیا اُس وقت تک پھڑپھڑاتی رہی جب تک اُڑ نکلنے کی امید تھی۔ اُس کے بعد وہ پنجۂ صیاد اور تیغ قاتل کے لئے تیار ہو گئی۔ انتہائی خوف کا نام دلیری ہے۔

اُس نے دھرم ویر کو پکارا، "بیٹا کچھ آ کر کھا لو۔"

دھرم ویر اندر آیا۔ آج دن بھر ماں اور بیٹے میں ایک بات بھی نہ ہوئی تھی۔ اس وقت ماں نے دھرم ویر کو دیکھا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا وہ ضبط جس سے آج اُس نے دن بھر اپنے اندرونی اضطراب کو چھپا رکھا تھا۔ جو اب تک سنگدلی کی صورت میں نمایاں ہو رہا تھا۔ خطرہ کے

قریب آجانے پر پگھل گیا تھا۔ جیسے کوئی بچّہ بھالو کو دُور سے دیکھ کر تو خوشی سے تالیاں بجاتے۔ لیکن اس کے قریب آنے پر چیخ اُٹھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں رونے لگے۔

ماں کا دل مسرت سے کھِل اٹھا۔ اُس نے آنچل سے دھرم دیر کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "چلو بیٹا! یہاں سے کہیں بھاگ چلیں۔"

دھرم دیر خیال میں غرق کھڑا تھا۔ ماں نے پھر کہا: "کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے باہر نکل جائیں۔ جس میں کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ قوم کی خدمت کرنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں۔"

دھرم دیر کی حمیت بیدار ہوئی۔ بولا "یہ نہیں ہو سکتا، اماں فرض تو فرض ہے، اسے ادا کرنا پڑے گا۔ چاہے رو کر ادا کر دوں یا ہنس کر۔ ہاں اس خیال سے وحشت ہوتی ہے کہ انجام نہ جانے کیا ہو۔ ممکن ہے نشانہ خطا کر جائے اور گرفتار ہو جاؤں یا اُس کی گولی کا نشانہ بنوں۔ لیکن اب تو ہرچہ بادا باد، مر بھی جائیں گے تو نام تو چھوڑ جائیں گے۔" ایک لمحہ کے بعد اس نے پھر کہا: "اس وقت تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ ہاں اب تیاری کرنی چاہیئے۔ تمہارا جی نہ چاہتا ہو نہ چلو، میں اکیلا چلا جاؤں گا۔"

ماں نے شکوہ کے انداز سے کہا: "مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں ہے بیٹا۔ میری جان تو تم تھے، تمہیں دیکھ کر جیتی تھی۔ تمہیں چھوڑ کر میری زندگی اور موت دونوں برابر ہیں۔ بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔"

دھرم دیر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دونوں اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ماں کی تیاری ہی کیا تھی۔ ایک بار ایشور کا دھیان کیا، ریوالور لیا اور چلنے کو تیار ہو گئی۔ دھرم دیر کو اپنا روزنامچہ بھرنا تھا۔ وہ روزنامچہ بھرنے بیٹھا۔

تو جذبات کا دریا اُمنڈ پڑا۔ یہ روانی یہ آمد اُس کے لئے نئی چیز تھی - جیسے دل میں کہیں سوتا کھُل گیا ہو۔ انسان لافانی ہے امر ہے۔ یہی اس روانی کا موضوع تھا۔ آغاز ایک دردناک الوداع سے ہُوا۔

رخصت! اے دُنیا کی دلچسپیو رخصت! اے زندگی کی بہار و رخصت اے رحم ہائے شیریں رخصت! برادران وطن! اپنے اس محروم اور مجروح خادم کے لئے دعائے خیر کرنا زندگی عزیز ہے، اس کا تجربہ ہُوا! آہ! وہی غم و الم کے نشتر وہی حسرتیں اور مایوسیاں جنہوں نے زندگی کو تلخ کر رکھا تھا۔ فی الواقع سرمایہ حیات ہیں۔ یہ نور سحر کی سنہری بارش، یہ شام کی رنگین ہوائیں۔ یہ گلی کوچے یہ درو دیوار دیکھنے پھر نہ نصیب ہوں گے۔ زندگی بندشوں کا نام ہے بندشیں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی ہیں۔ حیات کا شیرازہ بکھر رہا ہے، اے دل کی آزادی آ تو تمہیں گور حسرت میں دفن کر دوں۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ اہل وطن پھلیں پھولیں۔ وطن سر سبز اور شاداب ہو۔ کوئی مضائقہ نہیں ہم کیا اور ہماری حقیقت ہی کیا، مگر گلشن بلبلوں سے خالی نہ رہے گا۔ میری اپنے بھائیوں سے اتنی ہی التجا ہے کہ جس وقت آپ آزادی کے نغمے گائیں تو اس غریب کو دُعائے خیر سے یاد کر لیں۔

روزنامچہ بند کر کے اس نے ایک لمبی سی سانس کھینچی اور اٹھ کھڑا ہُوا کپڑے پہنے، ریوالور جیب میں رکھا اور بولا "اب تو وقت ہو گیا اماں"

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ گھر سنبھالنے کی کسے پروا تھی۔ جو چیز جہاں پڑی تھی۔ وہیں پڑی رہی۔ یہاں تک کہ چراغ بھی گل نہ کیا گیا۔ دونوں خاموش گھر سے نکلے۔ ایک مردانہ وار قدم اٹھاتا ہُوا۔ دوسری متفکر اور مغموم اور بار مجبوری سے جھکی ہوئی راستہ میں بھی تبادلہ الفاظ نہ ہُوا۔ دونوں نوشتۂ تقدیر کی طرح

اٹل خاموش اور سرگرم تھے۔ حصہ نثر پر شکوہ قومی اور تحریک عمل مستحسن، حصہ نظم درد اور تمانیت اور التجا سے لرزاں۔

جھاڑی میں پہنچ کر دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد صاحب کا موٹر نکلا۔ دھرم ویر نے غور سے دیکھا۔ موٹر کی رفتار سست تھی صاحب اور لیڈی دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ نشانہ غیر متوقع تھا۔ دھرم ویر نے جیب سے ریوالور نکالا۔ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور موٹر آگے نکل گیا۔ دھرم ویر نے کہا "یہ تم نے کیا کیا اماں۔ ایسا سنہرا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا"

ماں نے کہا "موٹر میں میم بھی تھی۔ کہیں میم ہی کو گولی لگ جاتی تو؟"

"تو کیا مضائقہ تھا۔ ہمارے مذہب میں ناگ اور ناگن اور سنپولے میں کوئی بھی فرق نہیں"

ماں نے نفرت آمیز لہجہ میں کہا "تو تمہارا مذہب درندوں اور وحشیوں کا ہے جو جنگ کے بنیادی اصولوں کی بھی پروا نہیں کرتا۔ عورت ہر ایک مذہب میں معصوم سمجھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وحشی بھی اس کا احترام کرتے ہیں"

"میں واپسی کے وقت ہرگز نہ چھوڑوں گا"

"میرے جیتے جی تم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے"

"میں اس معاملے میں تمہاری پابندیوں کا غلام نہیں ہو سکتا"

ماں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نامردانہ ضرب سے اس کی مامتا ریزہ ریزہ ہو گئی۔ مشکل سے بیس منٹ گزرے ہونگے کہ وہی موٹر دوسری جانب سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ دھرم ویر نے موٹر کو غور سے دیکھا اور اچھل کر بولا "تو اماں اب کی بار صاحب اکیلا ہی ہے۔ تم بھی میرے ساتھ نشانہ لگانا"

ماں نے لپک کر دھرم ویر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجنونانہ تندہی کے ساتھ اس

کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے لگی۔ دھرم ویر نے اس کو ایک دھکا دے کر گرا دیا اور ایک قدم ہٹ کر ریوالور سادھا۔ ایک سیکنڈ میں ماں اٹھی۔ اسی وقت گولی چلی۔ موٹر آگے نکل گئی۔ مگر ماں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔

دھرم ویر ریوالور پھینک کر ماں کے پاس گیا۔ اور گھبرا کر بولا "اماں! کیا ہُوا؟" پھر یکایک اس سانحہ کا علم اس کے اندر چمک اٹھا۔ وہ اپنی پیاری ماں کا قاتل ہے۔ اس کی فطرت کی ساری درشتی اور تیزی اور گرمی بجھ گئی۔ آنسوؤں کی بڑھتی ہوئی لرزش کو محسوس کرتا ہوا وہ نیچے جھکا۔ اور ماں کے چہرہ کی طرف اشک آلود پشیمانی سے دیکھ کر بولا "یہ کیا ہوگیا اماں! ہائے تم کچھ بولتی کیوں نہیں یہ کیسے ہوگیا، اندھیرے میں کچھ نظر بھی تو نہیں آتا۔ کہاں گولی لگی؟ کچھ بتاؤ۔ آہ اس بدنصیب کے ہاتھوں تمہاری موت لکھی تھی۔ جس کو تم نے گود میں پالا وہی تمہارا قاتل ہُوا۔ کس کو بلاؤں کوئی نظر بھی تو نہیں آتا۔"

ماں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "میرا جنم سپھل ہو گیا۔ بیٹا تمہارے ہاتھوں میری مٹی اٹھیگی۔ تمہاری گود میں مر رہی ہوں۔ سینہ میں زخم ہو گیا ہے۔ جونہی تم نے گولی چلائی، میں تمہارے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اب نہیں بولا جاتا۔ پرماتما تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ میری یہ دُعا ہے۔ میں اور کیا کرتی بیٹا! ماں کی آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے، میں تو چلی۔"

ایک لمحہ کے بعد اس تاریک سناٹے میں دھرم ویر اپنی عزیز ماں کے تن نیم جاں کو گود میں لئے گھر چلا۔ تو اس کے ٹھنڈے تلووں سے اپنی آنسو بھری آنکھیں رگڑ کر روحانی مسرت سے بھری ہوئی خلش محسوس کر رہا تھا۔

سنی

مُلیا کو دیکھتے ہوئے اس کا شوہر کلو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مُلیا خوش و خرم ہے اور کلو مغموم اور متفکر؟ مُلیا کو کوڑی ملی ہے، اُسے دوسرا کون پوچھے گا، کلو کو جواہر ملا ہے۔ اُس کے سینکڑوں خریدار ہو سکتے ہیں۔ خاص کر اُسے اپنے چچا زاد بھائی راجہ سے بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ خوبصورت ہے اور رنگین مزاج، باتیں کرنے میں چالاک ہے، اور عورتوں کو رجھانا خوب جانتا ہے اس لئے کلو مُلیا کو باہر نہیں نکلنے دیتا۔ اس پر کسی کی نظر بھی پڑ جائے۔ یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اب شب و روز محنت کرتا ہے۔ تاکہ ملیا کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو، اُسے نہ جانے کس جنم کے پُن سے یہ عورت ملی ہے اور وہ اس پر دل و جان قربان کر دینا چاہتا ہے۔ ملیا کا کبھی سر بھی دکھتا ہے۔ تو اُس کی جان نکل جاتی ہے۔ مُلیا کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک کلو گھر واپس نہیں آتا ہی ہے آپ بنی رہتی ہے۔ گاؤں میں کتنے ہی نوجوان ہیں جو مُلیا سے چھیڑ کیا کرتے ہیں۔ مگر اُس کی نظر میں بدصورت کلو دنیا کے ہر انسان سے بہتر ہے۔

ایک دن راجہ نے کہا: "بھابی، بھیا تمہارے قابل نہیں ہیں"۔

مُلیا نے فوراً جواب دیا: "قسمت میں تو وہی لکھے تھے تمہیں کیونکر پاتی"۔

راجہ نے دل میں سوچا اب مار لیا ہے۔ بولا "بھگوان نے بھی تو غلطی کی ہے"
ملیا مسکرا کر بولی "اپنی غلطی کو وہی ٹھیک کرے گا"
راجہ خوش ہو گیا۔

(۲)

تیج کے دن کلو ملیا کے لئے لہنگے کی ساڑھی لایا۔ جی تو چاہتا تھا کہ کوئی عمدہ سی ساڑھی لے مگر روپیہ نہ تھے۔ اور بزاز نے ادھار نہ مانا۔

راجہ بھی اسی دن قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ ایک عمدہ سی چندری لا کر ملیا کی نذر کی۔

ملیا نے کہا "میرے لئے تو ساڑھی آگئی ہے"

راجہ بولا "میں نے دیکھی ہے جبھی تو اسے لایا ہوں، وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ کلیا کو کتنا بیت بھی سوجھتی ہے تو ایسی باتوں میں"

ملیا نے ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر کہا "تم سمجھا کیوں نہیں دیتے"

راجہ پر ایک پیالے کا نشہ چڑھ گیا۔ بولا "بڈھا طوطا کہیں پڑھتا ہے"

ملیا "مجھے تو لہنگے کی ساڑھی پسند ہے"

راجہ "ذرا یہ چندری پہن کر تو دیکھو کیسی کھلتی ہے"

ملیا "جو لہنگا پہنا کر خوش ہوتا ہے وہ چندری پہننے سے خوش نہ ہوگا۔ اسے چندری پسند ہوتی تو وہ چندری ہی لاتا"

راجہ "انہیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے"

ملیا نے تعجب سے کہا "تو کیا میں ان سے بغیر پوچھے لے لوں گی؟"

راجہ "اس میں پوچھنے کی کونسی بات ہے۔ جب وہ کام پر چلے جائیں۔ تب

پہن لینا، میں بھی دیکھ لوں گا۔"

مُلیا قہقہہ مار کر ہنستی ہوئی بولی "یہ نہ ہوگا۔ دیور جی! کہیں دیکھ لیں تو میری شامت ہی آجائے۔ اسے تم لیتے جاؤ۔"

راجہ نے بضد ہو کر کہا۔ "ایسے نہ لوگی بھابی! تو میں زہر کھا کر سو رہوں گا۔"

مُلیا نے ساڑھی اٹھا کر طاق پر رکھ دی اور بولی "لو اب تو خوش ہو۔"

راجہ نے انگلی پکڑی "ابھی تو بھیا نہیں ہیں۔ ذرا پہن لو۔"

مُلیا نے اندر جا کر ساڑھی پہن لی۔ اور پھول کی طرح مہکتی دمکتی باہر آئی۔

راجہ نے بازو پکڑنے کو ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "ایسا جی چاہتا ہے کہ تمہیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں۔"

مُلیا نے اُسی سرور انگیز انداز سے جواب دیا۔ "جانتے ہو تمہارے بھیا کا کیا حال ہوگا؟"

یہ کہہ کر مُلیا نے کواڑ بند کر لئے۔ راجہ کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا سامنے سے پروسی ہوئی تھالی اُٹھالی گئی۔

(۳)

مُلیا کا جی تو یہی چاہتا تھا۔ کہ چندری کلو کو دکھا دے۔ مگر نتیجہ سوچ کر ہمت نہ پڑتی تھی۔ اُس نے چندری رکھ کیوں لی۔ اُسے اپنے اوپر غصہ آ رہا ہے۔ لیکن راجہ کو کتنا رنج ہوتا؟ کیا ہوا۔ اس کی چندری ذرا دیر پہن لینے سے اُس کا دل تو رہ گیا۔ لیکن اس کے دل کی ساکت گہرائیوں میں یہ ایک کیڑا جیسے اُسے منغص رہا تھا۔ اس نے کیوں چندری رکھ لی۔ کیا یہ کلو کے ساتھ دغا نہیں تھی۔ اس کا دل اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا۔ اُس نے دل کو سمجھایا، دغا کیوں ہوئی، اس میں دغا کی کونسی بات ہے؟

کیا وہ راجہ سے بولی؟ ذرا سا ہنس دینے سے اگر کسی کا دل خوش ہو جاتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔

کلو نے پوچھا "آج راجہ کیا کرنے آیا تھا؟"

مُلیا کا بدن کانپنے لگا، بہانہ کر کے بولی "تمبا کو مانگنے آئے تھے۔"

کلو نے ناک سکوڑ کر کہا "اُسے اندر مت آنے دیا کرو۔ اچھا آدمی نہیں ہے۔"

مُلیا۔ "میں نے کہہ دیا۔ تمبا کو نہیں ہے تو چلے گئے۔"

کلو نے کسی قدر تیز ہو کر کہا "کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ وہ تمبا کو مانگنے نہیں آیا۔"

مُلیا۔ "تو اور یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

کلو۔ "اور کسی کام سے آیا ہو، مگر تمبا کو مانگنے نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا۔ میرے گھر میں تمبا کو نہیں ہے۔ میں تمبا کو کے لئے خود ہی اُس کے گھر گیا تھا۔"

مُلیا کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ سر جھکا کر بولی "میں کسی کے من کا حال کیا جانوں؟"

آج تیج کا برت تھا۔ مُلیا پوجا کا سامان کر رہی تھی۔ پر اس طرح گویا اُس کے دل میں ذرا بھی اعتقاد، ذرا بھی شوق نہیں ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ گویا اُس کے منہ میں کالکھ پُت گئی ہے۔ اور اب وہ کلو کی آنکھوں سے گر گئی ہے۔ اُسے اپنی زندگی ویران نظر آتی ہے۔

سوچنے لگی۔ بھگوان نے مجھے یہ حُسن کیوں دیا۔ یہ روپ نہ ہوتا۔ تو راجہ کیوں میرے پیچھے پڑتا، اور کیوں آج میری یہ حالت ہوتی۔ میں کالی اور بدصورت ہو کر اس سے کہیں زیادہ سُکھی ہوتی۔ تب تو دل اتنا چنچل

نہ ہوتا۔ جنہیں روپ کی کمائی کھانی ہو، وہ روپ کو لے جائیں۔ یہاں تو اُس نے زندگی برباد کر دی۔

نہ جانے کب اُسے نیند لگ گئی تو دیکھتی ہے۔ کلو مر گیا ہے۔ اور راجہ گھر میں گھس کر اُسے پکڑنا چاہتا ہے۔ اُسی وقت ایک بوڑھی عورت نہ جانے کدھر سے آکر اُسے گود میں لے لیتی ہے۔ اور کہتی ہے " تو نے کلو کو کیوں مار ڈالا"

مُلیا رو رو کر جواب دیتی ہے " ماں میں نے انہیں نہیں مارا" بڑھیا جواب میں کہتی ہے " ہاں تو نے انہیں چھُری کٹار سے نہیں مارا۔ لیکن تیری دغا کٹار سے زیادہ قاتل تھی" مُلیا رو دی۔

مُلیا نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ تو سامنے صحن میں کلو سو رہا تھا، وہ دوڑی ہوئی اُس کے پاس گئی۔ اور اُس کی چھاتی پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کلو نے گھبرا کر پوچھا " کون ہے؟ مولا کیوں روتی ہو؟ کیا ڈر گئیں میں تو جاگ ہی رہا ہوں"

مُلیا نے سسکی لیکر کہا " مجھ سے آج ایک خطا ہو گئی، اسے معاف کر دو"

کلو اٹھ بیٹھا اور بولا " کیا بات ہے؟ کہو تو کیوں روتی ہو"

مُلیا " راجہ تمباکو مانگنے نہیں آیا تھا۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا"

کلو ہنس کر بولا " وہ تو میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا"

مُلیا " وہ میرے لئے ایک چندری لائے تھے"

" تم نے لوٹا دی نہ"

مُلیا کانپتی ہوئی بولی " میں نے لے لی۔ کہتے تھے میں زہر کھا لوں گا"

کلو لمبی سانس لے کر چارپائی پر گر پڑا۔ اور بولا " روپ تو میرے بس

کی بات نہیں ہے بھگوان نے بدصورت بنا دیا۔ تو سُندر کہاں سے ہو جاؤں "

کلو نے اگر مُلیا کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا ہوتا۔ تو بھی اُسے اتنا درد نہ ہوتا۔

(۳)

کلو اُس دن سے کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ زندگی میں نہ وہ شوق رہا اور نہ وہ مزا، ہنسنا بولنا گویا بھول گیا۔ مُلیا نے اُس کے ساتھ جتنی دغا کی تھی، اُس سے کہیں زیادہ اُس نے سمجھ لیا۔ اور یہی شبہ اس کے دل میں سرطان کی طرح چمٹ گیا۔ وہ گھر اب اُس کے لئے صرف اُٹھنے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اور مُلیا صرف کھانا پکانے والی مشین۔ حظِ نفس کے لئے وہ کبھی کبھی "تاڑی خانے" چلا جاتا یا چرس کے دم لگاتا۔

مُلیا اُس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی تھی، وہ اس شبہ کو اُس کے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اس لئے دل و جان سے اُس کی خدمت کرتی، اُسے خوش رکھنے کی مسلسل کوشش کرتی رہتی۔ مگر وہ جتنا ہی اُسے کھینچنے کی کوشش کرتی، اُتنا ہی دُور وہ اُس سے کھینچتا تھا۔ گویا کوئی کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی ہو۔ غنیمت یہ ہوئی۔ کہ راجہ جس انگریز کے یہاں نوکر تھا۔ اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اور وہ اُس کے ساتھ چلا گیا۔ نہیں تو دونوں بھائیوں میں سے کسی نہ کسی کا ضرور خون ہو جاتا۔ اس طرح سال بھر اور گزر گیا۔

ایک دن کلو رات کو گھر لوٹا تو اُس کو بخار تھا۔ دوسرے دن اُس کے جسم میں دانے نکل آئے۔ مُلیا نے خیال کیا۔ ماتا ہے۔ مان منوتی کرنے لگی۔ مگر چار یا پنچ دن ہی میں دانے بڑھ کر آبلے ہو گئے۔ اور معلوم ہوا۔ یہ ماتا نہیں

ہے اگر یہی ہے۔ کلو کی خرمستی یہ رنگ لائی تھی۔

بیماری سیلاب کی رفتار سے بڑھنے لگی۔ آبلوں میں مواد پڑ گیا۔ اور اُن میں سے ایسی بدبو نکلنے لگی۔ کہ پاس بیٹھتے ناک پھٹتی تھی۔ دیہات میں جس طرح کا علاج ہو سکتا تھا۔ وہ مُلیا کرتی تھی۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ اور کلو کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔ علاج کے لئے پیسے کی بھی ضرورت تھی اور مُلیا کو اب محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ کلو اُدھر اپنے کئے کا پھل بھوگ رہا تھا۔ مُلیا اُدھر دوا دارو میں مری جا رہی تھی۔ اگر کچھ صبر تھا تو یہی کہ کلو کا اندیشہ اور شبہ اس کی اس خدمت گزاری سے دور ہوتا جاتا تھا۔ اُسے اب یقین ہو رہا تھا۔ کہ مُلیا اب بھی اُسی کی ہی ہے۔ وہ اگر کسی طرح اچھا ہو جاتا۔ تو پھر اُسے دل میں رکھتا۔ اور اُس کی پرستش کرتا۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ مُلیا نے کلو کا ہاتھ منہ دُھلا کر دوا پلائی۔ اور کھڑی پنکھا جھل رہی تھی۔ کہ کلو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "مولا! میں نے پچھلے جنم میں کوئی بھاری تپ کیا تھا۔ کہ تم مجھے مل گئیں۔ اگر تمہاری جگہ مجھے دنیا کا راج بھی ملے تو نہ لوں۔"

مُلیا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر لیا۔ اور بولی۔ "اگر اس طرح کی باتیں کرو گے، تو میں رونے لگوں گی۔ میں بڑی قسمت ور تھی۔ کہ تم جیسا شوہر پایا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے دونوں ہاتھ شوہر کے گلے میں ڈال دیئے۔ اور بولی۔ "بھگوان نے مجھے میرے پاپوں کا بدلہ دیا ہے۔" کلو نے پُر خلوص نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ "سچ کہو مولا! راجہ اور تم میں کیا معاملہ تھا؟"

مُلیا نے حیرت میں آکر کہا۔ "میرے اور اُن میں اگر کوئی اور معاملہ ہو۔ تو

بھگوان میری اس سے بُری حالت کریں۔ اُس نے مجھے چندری دی تھی، وہ میں نے لے لی تھی۔ پھر میں نے اُسے آگ میں جلا دیا۔ تب سے میں اُس کے ساتھ نہیں بولی۔"

کلو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔" میں نے کچھ اور ہی سمجھ رکھا تھا۔ نہ جانے میری سمجھ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ تمہیں پاپ لگا کر خود ہی پاپ میں پھنس گیا۔ اور اب اُس کا پھل بھوگ رہا ہوں۔"

اُس نے رو رو کر اپنی بے راہ روی کا پردہ فاش کرنا شروع کیا۔ اور مُلیا آنسو کی لڑیاں بہا بہا کر سننے لگی۔ اگر شوہر کی فکر نہ ہوتی۔ تو اُس نے زہر کھا لیا ہوتا۔

کئی مہینے بعد۔ راجہ چھٹی لے کر آیا۔ اور کلو کی مہلک بیماری کا حال سُنا تو بہت خوش ہوا۔ تیمارداری کے بہانے سے کلو کے گھر آنے جانے لگا۔ کلو اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتا۔ لیکن وہ دن میں دو چار بار پہنچ ہی جاتا تھا۔

ایک دن مُلیا کھانا پکا رہی تھی۔ کہ راجہ نے رسوئی خانہ کے دروازے پر آکر کہا۔" بھابی! کیا اب بھی مجھ پر مہربانی نہ ہو گی؟ کتنی بیرحم ہو تم؟ کتنے دن سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ مگر تم مجھ سے بھاگتی پھرتی ہو۔ بھیا اب اچھے نہ ہوں گے۔ انہیں کھ‌ئی ہو گئی ہے۔ ان کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کر رہی ہو؟ تمہارا گلاب سا بدن سُوکھ گیا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ کچھ زندگی کے مزے اڑائیں، یہ جوانی بہت نہیں رہے گی۔ یہ دیکھو تمہارے لئے ایک کرن پھول لایا ہوں۔ ذرا پہن کر مجھے دکھا دو۔"

اُس نے کرن پھول مُلیا کی طرف بڑھا دیا۔ مُلیا نے اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ چولھے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔" لالہ، تمہارے پیروں

پڑتی ہوں، مجھے مت چھیڑو! یہ ساری مصیبت تمہاری لائی ہوئی ہے۔ تمہیں میرے دشمن ہو، پھر بھی تمہیں شرم معلوم نہیں ہوتی۔ کہتے ہو بھیا اب کس کام کے ہیں؟ مجھے تو اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ تب میں نہ ہوتی۔ تو وہ دوسری سگائی کر لیتے۔ اپنے ہاتھوں ٹھونک کھاتے۔ آج میں ہی اُن کا سہارا ہوں۔ وہ میرے سہارے زندہ ہیں۔ اگر اس مصیبت میں میں اُن سے دغا کروں تو مجھ سے بڑھ کر پاپی اور کون ہوگا؟ اور جب میں جانتی ہوں کہ اس مصیبت کا کارن بھی میں ہی ہوں۔"

راجہ نے ہنس کر کہا "یہ تو وہی ہوا۔ جیسے کسی کی دال گر گئی۔ تو اُس نے کہا۔ مجھے تو سوکھی ہی اچھی لگتی ہے۔"

مُلیا نے نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا "تم اُن کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو، بکتے کیا ہو؟ اُجلے کپڑے اور چکنے مکھڑے سے کوئی آدمی نہیں ہو جاتا۔ میری آنکھوں میں تو اب اُن کے سامنے کوئی جچتا نہیں۔"

کلو نے پکارا۔ مولا تھوڑا پانی دے۔ مُلیا پانی لے کر دوڑی۔ چلتے چلتے کرن پھول ایسا کھٹکا یا کہ صحن میں جا کر گرا۔ راجہ نے جلدی سے کرن پھول اٹھا لیا اور غصّہ میں چلا گیا۔

(۵)

کلو کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ معقول علاج ہوتا تو شاید اچھا ہو جاتا مگر اکیلی مُلیا کیا کیا کرتی۔ غریبی میں بیماری کوڑھ میں کھاج ہے۔

آخر ایک دن ملک الموت کا پیغام آ ہی پہنچا۔ مُلیا گھر کا کام کاج کر کے آئی۔ تو دیکھا کلو کی سانس زور زور سے چل رہی ہے۔ گھبرا کر بولی۔ "کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

کلو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ہاتھ جوڑے اور سر نیچا کر لیا۔ یہ دمِ واپسیں تھا۔

ملیا اُس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اور ہذیان کے عالم میں بولی۔ تم سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا بھگوان! اور اس پر دیالو کہلاتے ہو۔ اسی لئے مجھے پیدا کیا تھا۔ یہی تماشا دکھانے کے لئے، ہائے میرے سرتاج! تم تو اتنے بیدرد نہ تھے۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جارہے ہو۔ ہائے اب کون مولا کہہ کر پکارے گا۔ اب کس کے لئے کنوئیں سے پانی بھر کر لاؤں گی۔ کیسے بٹھا کر کھلاؤں گی۔ کیسے پنکھا ڈلاؤں گی، بھگوان! سب کچھ لیا تو مجھے کیوں نہیں لے چلتے"

سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ سبھی سمجھا رہے تھے۔ ملیا کو صبر نہ ہوتا تھا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ یہ بات اُسے نہ بھولتی۔

(۶)

کلو کو چھ مہینے ہو گئے۔ ملیا کماتی ہے۔ کھاتی ہے۔ اور اپنے گھر میں پڑی رہتی ہے۔ دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی۔ ہاں رات کو اکیلے میں بیٹھ کر کچھ دیر رو لیا کرتی ہے۔

ادھر راجہ کی عورت بھی مر گئی۔ مگر دو ہی چار دن کے بعد وہ پھر چھیلا بنا گھومنے لگا۔ اب اور بھی چھوٹا سانڈ ہو گیا۔ پہلے عورت سے لڑائی ہو جانے کا خوف تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ اب کی نوکری سے لوٹا تو سیدھا ملیا کے گھر پہنچا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولا۔ "بھابی! اب تو میری امید پوری کرو گی یا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟ اب تو بھیا بھی نہیں رہے۔ اور ادھر میرے گھر والی بھی مر گئی۔ میں نے تو اس کا غم بھلا دیا۔ تم کب تک بھیا کے

نام کو روتی رہو گی "

کملیا نے نفرت سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا "بھیّا نہیں رہے۔ تو کیا ہوا؟ بھیّا کی یاد تو ہے۔ اُن کی محبت تو ہے۔ اُن کی صورت تو دل میں ہے۔ اُن کی باتیں تو کانوں میں ہیں۔ میرے لئے وہ اب بھی ویسے ہی جیتے جاگتے ہیں۔ میں اب بھی اُنہیں ویسے ہی بیٹھا ہُوا دیکھتی ہوں۔ پہلے تو بدن کا بیچ تھا۔ اب تو وہ مجھ سے اور بھی قریب ہو گئے ہیں۔ اور جیوں جیوں دن گزریں گے۔ اور بھی قریب ہوتے جائیں گے۔ بھرے پُرے گھر میں دانے کی کون قدر کرتا ہے۔ جب گھر خالی ہو جاتا ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ دانہ کیا چیز ہے؟ پیسے والے پیسے کی قدر کیا جانیں؟ پیسے کی قدر تب ہوتی ہے جب ہاتھ خالی ہوتا ہے۔ اس وقت آدمی ایک ایک کوڑی کو دانت سے اٹھاتا ہے۔ تمہیں بھگوان نے دل ہی نہیں دیا۔ تم کیا جانو محبت کیا چیز ہے؟ گھر والی کو مرے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے۔ اور تم سانڈ بنے پھرتے ہو؟ تم مر گئے ہوتے۔ تو اسی طرح وہ بھی اب تک کسی کے پاس چلی گئی ہوتی۔ مگر جانتی ہوں، میں مر جاتی تو میرا سرتاج عمر بھر میرے نام کو رویا کرتا۔ ایسے ہی مردوں کی عورتیں اُن پر جان دیتی ہیں۔ تم جیسے شہدوں کی قسمت میں دوسروں کا جوٹھا کھانا ہی بدا ہے کھاؤ۔ مگر خبردار آج سے میرے گھر میں پاؤں مت رکھنا۔ نہیں تو جان سے ہاتھ دھوؤ گے۔ نکل جاؤ۔ میرے گھر سے"

چہرے پر اتنا جلال اور لہجہ میں اتنی تندی تھی۔ کہ راجہ کو زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چپکے سے نکل گیا۔

ڈیمانسٹریشن

تمہید

مہاشے گورو پرشاد نہایت رنگین مزاج شخص ہیں۔ گانے بجانے کے رسیا ہیں۔ سیر و سیاحت سے دلچسپی ہے، کھانے کھلانے میں نہایت سیر چشم ہیں۔ یوں تو کسی کے محتاج نہیں، شریف آدمیوں کی طرح رہتے ہیں۔ اور ہیں بھی بھلے آدمی۔ لیکن کسی کام میں چمٹ نہیں سکتے۔ گڑ ہو کر بھی ان میں لیس نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس میں جھٹ پٹ قارون کا خزانہ مل جائے۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے بے فکر ہو جائیں۔ بینک سے ششماہی سود چلا آئے۔ کھائیں اور مزے سے پڑے رہیں۔ ایک دن بات بات میں کسی ستم ظریف نے مشورہ دیا، کوئی ناٹک کمپنی کھولو۔ بات معقول تھی۔ سمجھ میں آ گئی۔ دوستوں کو لکھا۔ میں بہت جلد ایک ڈرامیٹک کمپنی کھولنے جا رہا ہوں۔ آپ لوگ ڈرامے لکھنا شروع کیجئے۔ کمپنی کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے، کئی مہینے خوب گرم بازاری رہی، کتنے ہی بڑے بڑے آدمیوں نے حصے خریدنے کے وعدے کئے، لیکن نہ حصے بکے نہ کمپنی کھڑی ہوئی۔ ہاں اسی دھن میں گورو پرشاد نے ایک ناٹک ضرور تصنیف کر ڈالا۔ اور یہ فکر ہوئی۔ کہ اسے کسی

کمپنی کو دیا جائے۔ لیکن یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ کمپنی والے ایک ہی گھاگھ ہوتے ہیں۔ پھر ہر ایک کمپنی میں کسی غیر شخص کا داخلہ ہو، وہ اس تصنیف میں طرح طرح کے عیب نکالے گا۔ اور کمپنی کے مالک کو بھڑکا دے گا۔ بالآخر یہ ترکیب سوچی گئی کہ احباب کمپنی کے مالکوں پر کچھ ایسا رعب غالب کریں۔ کہ کمپنی کے ڈراما لسٹ کی دال گل ہی نہ سکے۔ چنانچہ پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس میں تمام پروگرام پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ اور دوسرے دن گورو پرشاد جی معہ اپنے رفقا کے ناٹک دکھانے چلے۔ ٹانگے آگئے۔ ہارمونیم طبلہ وغیرہ سب اُن پر لاد دیئے گئے، کیونکہ ناٹک کے DEMONSTRATION کا فیصلہ ہوا تھا۔

یکایک ونود بہاری نے کہا "یار ٹانگے پر جانے میں کچھ بدرعبی سی ہوگی۔ مالک سوچے گا۔ یہ مہاشے تو یوں ہی ہیں۔ اس وقت دس پانچ روپیہ کا منہ نہ دیکھنا چاہیئے۔ میں تو مغربی اشتہار بازی کا قائل ہوں۔ کہ روپے میں پندرہ آنے اسی میں لگا کر صرف ایک آنہ میں تجارت کرتے ہیں۔ کہیں سے دو موٹریں منگانی چاہئیں۔

رسک لال نے کہا " لیکن کرایہ کی موٹروں سے یہ بات پیدا نہ ہوگی جو آپ چاہتے ہیں۔ کسی رئیس سے دو موٹریں مانگ لینی چاہئیں۔ ماڈلیبن ہوں یا نئے فیشن کی آسٹین"۔

بات سچی تھی۔ بھیس سے بھیک ملتی ہے۔ قیاس آرائیاں ہونے لگیں، کس رئیس سے درخواست کی جائے، اجی وہ مہا گھوسٹ ہے۔ صبح صبح اس کا نام لیلو تو دن بھر پانی نہ ملے۔ اچھا سیٹھ جی کے پاس چلیں۔ تو کیسے؟ منہ دھو رکھیئے اس کی موٹریں افسروں کے لئے ریزرو ہیں۔ اپنے لڑکے

تک کو کبھی بیٹھنے نہیں دیتا۔ آپ کو دبئے دیتا ہے۔ تو چلو کپور صاحب کے پاس چلیں، ابھی اُنہوں نے نئی موٹر لی ہے۔ ابھی اس کا نام مت لو۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کرے گا۔ ڈرائیور نہیں ہے۔ زیر مرمت ہے۔ اس قسم کی باتیں بناتے کیا اُسے دیر لگتی ہے؟

گورو پرشاد نے مایوس ہو کر کہا "تم لوگوں نے خواہ مخواہ بکھیڑا کر دیا ٹانگوں پر چلنے سے کیا ہرج تھا؟"

دلود بہاری نے کہا "آپ لوگ کھاس کھا گئے ہیں۔ ناٹک لکھ لینا دوسری بات ہے۔ اور معاملہ کرنا دوسری بات ہے۔ میری بات سُنئے، فی صفحہ ایک روپیہ گنا دے گا، اپنا سا منہ لیکر رہ جائیے گا۔"

امرناتھ نے کہا "میں سمجھتا ہوں۔ موٹر کے لئے کسی راجہ رئیس کی خوشامد کرنا بیکار ہے۔ تعریف تو جب ہے کہ پیدل چلیں۔ اور وہاں ایسا رنگ جمائیں کہ موٹر سے زیادہ شان جم جائے۔"

دلود بہاری اُچھل پڑے۔ سب لوگ پیدل چلے۔ وہاں پہنچ کر کس طرح باتیں شروع ہوں۔ کس طرح تعریفوں کے پل باندھے جائیں۔ کس طرح ڈراما ٹسٹ صاحب کو خوش کیا جائے۔ تمام راستہ اسی پر گفتگو اور بحث کا بازار گرم رہا۔

آخر ہم لوگ کمپنی کے کیمپ میں پہنچے۔ تقریباً دو بجے کا وقت تھا، پروپرائٹر صاحب معہ اپنے ایکٹر اور ڈراما ٹسٹ کے پہلے ہی ہمارے انتظار میں تھے۔ پان، الائچی۔ سگریٹ وغیرہ پہلے ہی منگوا لئے گئے تھے۔ اوپر جاتے ہی رسک لال نے مالک سے کہا "معاف فرمائیے گا ہم لوگوں کو یہاں پہنچنے میں کسی قدر دیر ہوئی۔ موٹر سے نہیں بلکہ پیادہ آئے ہیں سبب

لوگوں کی یہی صلاح ہوئی کہ آج قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتے ہوئے چلیں۔ گورو پرشاد جی تو قدرت کے پرستاروں میں سے ہیں۔ اگر ان کا بس چلتا ہو، تو آج چمٹا لئے ہوئے یا تو کہیں بھیک مانگتے ہوئے خواہ کسی پہاڑ کی کھوہ میں یا گاؤں میں کسی برگد کے سایہ میں بیٹھے ہوئے خوش نوا پرندوں کے وجد انگیز نغموں سے محظوظ ہوتے۔"

ونود نے کہا "اور آج بھی تو سیدھے راستہ سے نہیں۔ نہ معلوم کہاں کہاں کا چکر کاٹتے خاک چھانتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے پاؤں میں سنیچر ہے۔"

امر نے کچھ اور ہی رنگ جمایا "پورے ست جگی آدمی ہیں۔ نوکر چاکر تو موٹروں پر سیر کرتے ہیں۔ اور آپ گی گی مارے پھرتے ہیں۔ جب اور رئیس خواب راحت کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ تو آپ ندی کے کنارے افق کی جلوہ نمائیوں میں محو رہتے ہیں۔" مست رام نے فرمایا "شاعر ہونے کے معنے دین دنیا سے بیگانہ ہو جانا ہے۔ گلاب کی ایک پنکھڑی لے کر اس میں نہ معلوم گھنٹوں کیا دیکھا کرتے ہیں۔ قدرت کے مشاہدے نے ہی یورپ کے بڑے بڑے شعراء کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ کاش یہ یورپ میں ہوتے۔ تو ان کے دروازے پر لکشمی جھومتا ہوتا۔ ایک دن ایک لڑکے کو روتے دیکھ کر آپ رونے لگے۔ ہر چند پوچھتا ہوں، بھئی کیوں روتے ہو؟ مگر جواب نہیں دیتے، بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے آواز نکلی۔

ونود "جناب! شاعر کا دل نازک اور لطیف جذبات کا سرچشمہ ہے نغمہ لطیف کی کان ہے، وسعت کا آئینہ ہے۔ واہ واہ آپ نے کیا بات کہی،

وسعت کا آئینہ، واہ! شاعر کی صحبت میں رہ کر آپ پر بھی شاعری کا رنگ غالب آتا جاتا ہے۔"

گورو پرشاد نے عاجزانہ انداز سے کہا "میں شاعر نہیں ہوں۔ اور نہ مجھے شاعری کا دعوٰے ہے۔ آپ لوگ مجھے زبردستی شاعر بنائے دیتے ہیں، شاعر قدرت کی وہ عجیب و غریب تخلیق ہے۔ جو عناصر خمسہ کی جبگہ نوروں سے ترکیب پاتی ہے۔"

مست رام "آپ کی ہی ایک بات ایسی ہے۔ جس پر سینکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ رشک لال جی! شاعر کی عظمت ذہن نشین ہوئی یا نہیں، یاد کر لیجئے۔ رٹ لیجئے۔"

رسک لال۔ "کہاں تک یاد کروں؟ یہ تو تشبیہات اور استعارات میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور انکساری کا یہ حال ہے کہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں قابلیت و ذہانت کی یہی علامت ہے۔ جس نے اپنے آپ کو سمجھا۔ بس وہ رہ گیا۔ (کمپنی کے مالک سے) آپ تو سب کچھ خود ہی سن لیں گے۔ اس ڈرامہ میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ شاعروں میں جو عام طور پر ایک خودنمائی ہوتی ہے، اس کی آپ میں کہیں بو بھی نہیں۔ اس ڈرامے کا مواد فراہم کرنے میں آپ نے کچھ نہیں تو کم از کم ایک ہزار بڑے بڑے پوتھوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ واجد علی شاہ کو خود غرض وقائع نگاروں نے کتنا بدنام کیا ہے۔ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ اس طومار میں سے حقیقت کا انتخاب کرنا انہی کا کام ہے۔"

ونود۔ "اسی لئے ہم اور آپ دونوں کلکتے گئے۔ اور وہاں متواتر چھ ماہ تک ٹلیا برج کی خاک چھانتے رہے۔ واجد علی شاہ کا قلمی مسودہ تلاش کیا۔

اس ڈرامہ کی تکمیل کے لئے اس کتاب کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ اس میں انہوں نے خود ہی اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ ایک بڑھیا کو بہت کچھ نذر کرتے پر چھ مہینے میں جاکر کتاب ملی ہے"
امرناتھ۔" کتاب نہیں، جواہرات کی کان ہے"
مست رام:" اُس وقت تو اس کی حالت کوئلے کی سی تھی۔ گورو پرشاد جی نے اس پر مہر لگا کر اشرفی بنا دیا۔ ڈراما ایسا ہونا چاہیئے کہ جو سُنے دل ہاتھوں سے تھام لے، ایک ایک نکتہ دل میں تیر و نشتر کی طرح اُتر جائے"
امرناتھ:" لٹریچر کے تمام ناٹکوں کو آپ نے چاٹ ڈالا۔ اور فن ڈراما پر سینکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔
ونود۔ جب ہی تو چیز بھی لاثانی ہوتی ہے"
امرناتھ۔" لاہور ڈرامیٹک کلب کا مالک ہفتہ بھر یہاں پڑا رہا۔ پیروں پڑا کہ یہ ناٹک مجھے دے دیجئے۔ لیکن آپ نے نہ دیا، نہ دیا۔ جب ایکٹر ہی اچھے نہیں۔ تو اُن سے اپنا ڈرامہ کھلوانا اس کی مٹی خراب کرنا تھا۔ اس کمپنی کے ایکٹر ماشاء اللہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور اس کے ڈراما نویس کی سارے زمانہ میں دھوم ہے۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ کر یہ ڈراما دھوم مچا دیگا"
ونود۔" ایک تو مصنف صاحب بذاتِ خود شیطان سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس پر ایکٹروں کا اسلوب، ساز و سامان، یہ تمام باتیں مل کر قیامت برپا کر دیگی"
مست رام:" روز ہی تو کسی کمپنی کا آدمی سر پر سوار رہتا ہے مگر بابو صاحب کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے"
ونود:" بس ایک یہ کمپنی ہے جس کے تماشہ کے لئے دل بے قرار رہتا ہے نہیں تو جتنے اور ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ وہ دو کوڑی کے ہوتے ہیں۔ ہیں

نے تو تماشہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔"

گورو پرشاد: "ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے، خونِ جگر پینا پڑتا ہے، میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لئے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں۔ بلکہ اچھا ڈراما زندگی میں ایک ہی لکھا جاتا ہے۔ یوں فلم گھسانا دوسری بات ہے۔ بڑے بڑے زبردست مبصرین کا یہی فیصلہ ہے۔ کہ ڈرامہ زندگی میں صرف ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ روس۔ فرانس۔ جرمنی، تمام زبان کے ڈرامے پڑھے، مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر ایک میں موجود ہے۔ کسی میں جذبات ہیں تو زبان نہیں۔ زبان ہے تو جذبات نہیں۔ مذاق ہے تو گانا نہیں، گانا ہے تو مذاق نہیں۔ جب تک جذبات، زبان، مذاق اور گانا یہ چاروں باتیں پورے طور پر موجود نہ ہوں۔ اُسے ڈراما کہنا ہی غلطی ہے میں تو نہایت ہی ناقابل شخص ہوں۔ آپ لوگوں کی صحبت میں کچھ شُد بُد کر لیتا ہوں۔ میری تصنیف کی حقیقت ہی کیا۔ لیکن اگر پرماتما نے چاہا۔ تو اس ڈراما میں ایسے نقائص آپ کو نہ ملیں گے۔"

ونود۔ جب آپ کی قابلیت کا یہ حال ہے تو نقائص رہ ہی کیسے سکتے ہیں؟"

رسک لال: "دس سال تک آپ نے صرف نغمہ کی ہی مشق کی ہے۔ ہزاروں روپے استادوں کی نذر کر دیئے۔ اگر اتنے پر بھی نقص رہ جائے تو بد قسمتی۔"

ری ہرسل

ری ہرسل شروع ہوئی۔ اور واہ واہ اور ہائے ہائے کا تار بندھا۔ کورس سنتے ہی ایکٹر، ڈائریکٹر اور ناٹک نویس جیسے کسی خوابِ گراں سے بیدار ہو اٹھے۔ تمہید نے انہیں زیادہ متاثر نہیں کیا۔ لیکن اصلی چیز سامنے آتے ہی

آنکھیں کھلیں۔ سماں بندھ گیا۔ پہلا سین آیا۔ آنکھوں کے سامنے واجد علی شاہ کے دربار کی تصویر کھنچ گئی۔ درباریوں کی حاضر جوابی اور پھڑکتے ہوئے لطیفے! واہ واہ کیا کہنا ہے۔ کیا طرزِ ادا تھی۔ اور کیا شوکت الفاظ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے تمام رس ایک ہی جگہ پر مجتمع ہو کر اپنی کیفیت دکھا رہے ہیں۔ تیسرا نظارہ مذاقیہ۔ ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیاں دُکھنے لگیں۔ چوتھا سین نہایت رنجیدہ اور تڑپا دینے والا تھا۔ مذاق کے بعد افسردگی۔ آندھی کے بعد آنے والا سکون تھا۔ ونود آنکھوں پر ہاتھ رکھے سر جھکائے رو رہے تھے۔ مست رام بار بار ٹھنڈی آہیں کھینچ رہے تھے۔ اور امرناتھ پیہم سسکیاں بھر رہے تھے۔ اسی طرح سین پر سین اور باب پر باب ختم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جب ریہرسل ختم ہوا۔ تو چراغ روشن ہو چکے تھے۔

سیٹھ جی اب تک سونٹھ بنے بیٹھے رہے۔ ڈراما ختم ہو گیا۔ لیکن اُن کی زبان پر اُن کی مبارک رائے کے عکس کا شائبہ تک نہ تھا۔ جڑ بھرت کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ نہ مسکراہٹ تھی نہ داد۔ نہ اشک نہ کچھ۔ آخر ونود بہاری نے معاملے کی بات پوچھی۔ کہ "اس ڈراما کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

سیٹھ جی نے اُسی بے نیازانہ انداز میں جواب دیا: "اس کے متعلق کل عرض کروں گا۔ کل یہیں کھانا بھی کھائیے گا۔ آپ لوگوں کے لائق کھانا کیا ہو سکے گا۔ اسے صرف دُور کا ساگ سمجھ کر قبول فرمائیے۔"

جیسے ہی پانچوں باہر نکلے، مارے خوشی کے سب کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ ونود نے کہا: "پانچ ہزار کی تھیلی ہے۔ ناک ناک بدسکتا ہوں۔"

امرناتھ ۔ پانچ ہزار ہے کہ دس ۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا ۔ لیکن رنگ خوب جما۔"
رسک لال :۔ میرا اندازہ تو چار ہزار تک ہے۔"
مست رام :۔ میرا تو یقین یہ ہے کہ دس ہزار سے کم کہے گا ہی نہیں ۔ میں تو سیٹھ کے چہرے کی طرف یکسوئی سے دیکھ رہا تھا ۔ آج ہی کہہ دیتا ۔ لیکن مست خوب ہو رہا تھا۔"
گورو پرشاد :۔ میں نے پڑھا بھی تو جی توڑ کر۔"
ونود :۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے آپ کے گلے میں سرسوتی بیٹھ گئی ہو ۔ سب کی آنکھیں کھل گئیں۔"
رسک لال :۔ مجھے اُس کی خاموشی سے ذرا اشتباہ ہوتا ہے۔"
امر :۔ ڈراماٹسٹ بھی خوب خوش ہو رہا تھا ۔ دس بارہ ہزار کا وارا نیارا ہے ۔ بھئی آج اسی خوشی میں دعوت ہونی چاہئیے۔"
گورو پرشاد :۔ ارے تو کچھ بھی بٹا تو جائے۔"
مست :۔ جی نہیں ۔ تب تو جلسہ ہوگا ۔ آج دعوت ہوگی۔"
ونود :۔ ہونہہ خوش قسمت۔"
رسک لال :۔ میری رائے میں تو اس ڈراماٹسٹ کو گانٹھ لیا جائے ۔ اس کی خاموشی مجھے خوف زدہ کر رہی ہے۔"
مست :۔ آپ کو تو خفقان ہو گیا ہے ۔ وہ ناک رگڑ کر رہ جائے تب بھی یہ سودا ہو کر ہی رہے گا ۔ سیٹھ جی اب بچ کر نکل نہیں سکتے۔"
ونود :۔ ہم لوگوں کی تمہید بھی ذمہ وار تھی۔"
امر :۔ اسی نے تو رنگ جما دیا ۔ اب کوئی چھوٹی رقم کہنے کا اُسے حوصلہ ہی نہ ہوگا۔"

تماشا

رات کو گورو پرشاد کے گھر دوستوں کی دعوت ہوئی۔ دوسرے دن چھ بجے پانچوں آدمی سیٹھ جی کے پاس جا پہنچے۔ شام کا وقت ہوا خوری کا تھا۔ آج موٹر پر نہ آنے کے لئے بنا بنایا بہانہ تھا۔ سیٹھ جی آج بے حد خوش نظر آتے تھے۔ کل کی وہ محرمی صورت غائب ہو گئی تھی۔ بات بات پر چہکتے تھے۔ ہنستے تھے۔ فقرے کستے تھے۔ جیسے لکھنؤ کا کوئی رئیس ہو۔ دعوت کا سامان تیار تھا۔ میز پر کھانا چُنا جانے لگا۔ انگور، سنگترے کیلے، خشک میوے، مختلف قسم کی مٹھائیاں، کئی طرح کے مربے شراب وغیرہ سجائے گئے۔ اور یاروں نے خوب مزے سے دعوت کھائی۔

سیٹھ جی مہمان نوازی کے پتلے بنے ہوئے ہر ایک مہمان کے پاس آ آ کر پوچھتے "کچھ اور منگواؤں؟ کچھ تو اور لیجئے۔ آپ لوگوں کے لائق کھانا یہاں کہاں بن سکتا ہے؟"

کھانے کے بعد لوگ بیٹھے تو معاملہ کی بات چیت ہونے لگی۔ گورو پرشاد کا دل اُمید و بیم سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

سیٹھ جی: "حضور نے نہایت بلند پایہ ڈراما لکھا ہے۔ کیا بات ہے؟"

ڈراماٹسٹ: "یہاں کی پبلک اچھے ڈراما کی قدر نہیں کرتی۔ ورنہ ڈراما لاجواب ہوتا۔"

سیٹھ جی: "پبلک قدر نہیں کرتی، نہ کرے، ہمیں اس کی بالکل پروا نہیں ہے، رتی بھر پروا نہیں ہے۔ میں تو اس کی تیاری میں صرف پچاس ہزار بابو صاحب کی خاطر جمع کر دوں گا۔ آپ نے جب اتنی محنت سے ایک

چیز لکھی ہے، تو میں اس کی اشاعت بھی اسی حوصلہ سے کروں گا۔ ہمارے لئے کیا یہ کم خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے معزز اصحاب اس میدان میں اتر آئے۔ یہ تماشا حضور کو زندۂ جاوید بنا دے گا۔"

ڈراما لسٹ۔ "میں نے ایسا ڈراما آج تک نہیں دیکھا۔ لکھتا میں بھی ہوں۔ اور لوگ بھی لکھتے ہیں۔ لیکن آپ کی پرواز تک کس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ کہیں تو آپ نے شکسپیئر کو بھی مات کر دیا ہے۔"

سیٹھ جی۔ "ہاں جناب جو چیز دل کی اُمنگ سے لکھی جاتی ہے۔ وہ ایسی ہی اچھوتی اور لاجواب ہوتی ہے۔ شکسپیئر نے جو کچھ لکھا۔ وہ روپیہ کے لالچ سے لکھا۔ ہمارے دوسرے ڈراما نویس بھی دولت کے لئے ہی لکھتے ہیں۔ ان میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ جو بغیر ضانہ لکھنے والوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ گوسائیں جی کی رامائن کیوں زندہ ہے۔ اس لئے کہ وہ بھگتی اور پریم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ سعدیؒ کی گلستاں، بوستاں، ہومر کی تصنیفات اس لئے مقبولِ عام ہیں کہ ان لوگوں نے دل کی امنگ سے لکھا ہے۔ جو امنگ ہے وہ ایک ایک لفظ، ایک جملہ اور ایک ایک ترکیب پر مہینوں کاوش کرتا ہے۔ مگر بندۂ دولت کو تو ایک کام ختم کر کے دوسرے کو شروع کرنے کا فکر ہوتا ہے۔"

ڈراما لسٹ۔ "آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہمارے ادب کی تنزلی کا باعث بھی یہی ہے۔ کہ ہم دولت کی غرض یا ناموری کے لئے لکھتے ہیں۔"

سیٹھ جی۔ "سوچیے۔ آپ نے دس ہزار صرف فنِ موسیقی کی تحصیل میں خرچ کر دیئے۔ لاکھوں روپے گویوں اور اہلِ ہنر کی نذر کر دیئے۔ کہاں کہاں سے اور کتنی جد و جہد سے اس ناٹک کا مصالحہ جمع کیا۔ نہ جانے کتنے والیانِ ریاست

کو سنایا، اس جدوجہد اور جانفشانی کی قیمت کون ادا کرسکتا ہے۔"

ڈراماٹسٹ "یہ ممکن ہی نہیں، ایسی تصنیف کے معاوضہ کا تصور کرنا ہی ان کی توہین کرنا ہے۔ ان کا معاوضہ اگر کچھ ہے تو وہ اپنی روح کی تشفی ہے اور وہ قناعت جو آپ کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔"

سیٹھ جی "آپ نے سچ کہا کہ ایسی تصانیف کا معاوضہ تسکین روح ہے۔ معاوضہ تو ایسی تصانیف کا بھی مل جاتا ہے، جو صحافت پر بدنما داغ ہیں۔ آپ ڈراما لے لیجئے۔ اور آج ہی پارٹ بھی تقسیم کر دیجئے۔ تین مہینے کے اندر اسے کھیل ڈالنا ہوگا۔"

میز پر مسودہ پڑا ہوا تھا۔ ڈراماٹسٹ نے اٹھا لیا۔ گورو پرشاد نے نیم باز نگاہوں سے ونود کی طرف دیکھا، ونود نے امر کی جانب، امر نے رسک کی طرف، لیکن لفظ کسی کے منہ سے نہ نکلا۔ جیسے سیٹھ جی نے سب کے منہ سی دیئے تھے۔ ڈراماٹسٹ صاحب کتاب لے کر چل دیئے۔

سیٹھ جی نے مسکرا کر کہا: "حضور کو تھوڑی سی تکلیف اور کرنی ہوگی، ڈراما کا ریہرسل شروع ہونے پر آپ کو تھوڑے دنوں کمپنی کے ساتھ رہنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑیگی۔ ہمارے ایکٹر بیشتر گجراتی ہیں، یہ ہندی زبان کے تلفظ کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے۔ کہیں کہیں الفاظ پر بلا ضرورت زور دے دیتے ہیں۔ آپ کی نگرانی سے یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔ اگر ایکٹروں نے پارٹ اچھا ادا نہ کیا، تو آپ کی تمام محنت پر پانی پھر جائے گا۔"

یہ کہتے کہتے اس نے لڑکے کو آواز دی "بوائے آپ لوگوں کے لئے سگار لاؤ۔"

سگار آ گیا۔ سیٹھ جی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ دوستوں کی انجمن کو رخصت ہو جانے کا اشارہ تھا۔ پانچوں دوست بھی اٹھے۔ سیٹھ جی دروازے تک آئے۔ پھر سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"آج اس غریب کمپنی کا تماشا دیکھ لیجئے۔ پھر خدا جانے کب اتفاق ہو۔"

گورو پرشاد نے جیسے کسی قبر کے نیچے سے کہا "ہو سکا تو آجاؤں گا۔"

سڑک پر آ کر پانچوں دوست ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے۔ تب پانچوں زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ونود نے کہا "یہ ہم سب کا ہی گورو گھنٹال نکلا۔"

امر "آنکھوں میں صاف دھول جھونک دی۔"

رسک "میں اس کی خاموشی دیکھ کر پہلے ہی سے ڈر رہا تھا کہ یہ کوئی اول درجہ کا گھاگھ ہے۔"

مست "مان گیا، اس کی کھوپڑی کو یہ چپت عمر بھر نہ بھولے گی۔"

گورو پرشاد ان چہ میگوئیوں میں شامل نہ ہو سکے۔ وہ اس طرح سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ اُن کے خیالات کی تہ تک ہی نہیں پہنچ سکے۔

برات

آج بابو دیو کی ناتھ اپنی پندرہ سال کی بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر نئی شادی کرنے جا رہے ہیں۔ عزیز و اقربا جمع ہیں۔ مگر کوئی یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ آخر اس بیکس پر اتنا عتاب کیوں ہے؟ بابو دیو کی ناتھ سے کیوں برے بنیں۔ دروازہ پر نوبت جھڑ رہی ہے۔ اندر مستورات بیاہ کے گیت گا رہی ہیں۔ نوکر چاکر خوش رنگ وردیاں پہنے ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ براتی اصحاب اپنی اپنی آرائش میں مصروف ہیں۔ مگر اس شادی کے ساتھ ایک عزیز جان کا خون ہو رہا ہے۔ اس کی کسی کو پروا نہیں ہے۔

آج پندرہ سال ہوئے جب دیو کی ناتھ کی شادی پھول وتی سے ہوئی تھی۔ پھول وتی حسین تھی، باتمیز تھی، شیریں دہن تھی، تعلیم یافتہ تھی۔ دیو کی ناتھ بھی نیک اطوار، مستقل مزاج۔ روشن خیال۔ مگر پہلے ہی دن دولہا دلہن میں کچھ ایسی بدمزگی پیدا ہوئی۔ کہ دونوں میں ایک خلیج حائل ہو گئی۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج دیو کی ناتھ نئی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اور اس بدمزگی کا باعث کیا تھا؟ معاشرتی معاملات میں اختلاف؟ دیو کی ناتھ پرانی تہذیب کے قائل تھے۔ پھول وتی نئی روشنی کی دلدادہ۔ پرانی تہذیب پردہ چاہتی ہے، تحمل اور صبر چاہتی ہے۔ نئی روشنی آزادی

چاہتی ہے، اعزاز چاہتی ہے، حکومت چاہتی ہے۔ دیو کی نانتھ چاہتے ہیں۔ پھول وتی میری ماں کی خدمت کرے۔ بغیر اجازت گھر سے قدم نہ نکالے۔ لمبا سا گھونگھٹ نکال کر چلے۔ پھول وتی کو ان باتوں میں سے ایک بھی پسند نہ تھی۔ دونوں میں مباحثے ہوئے۔ سخت کلامیوں کی نوبت آئی۔ شکر رنجی ہوئی۔ میاں نے بیوی کے میکے والوں کی تحقیر کی۔ بیوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میاں نے ڈانٹ بتائی۔ بیوی نے میکہ کی راہ لی۔ میکہ بھی دُور نہ تھا۔ دس منٹ میں گھر جا پہنچی۔ مہینوں تک دونوں کھنچے رہے۔ پھر پھول وتی منائی گئی۔ سسرال آئی۔ مگر دو ہی چار دن میں وہی قضیے شروع ہو گئے نہ دیو کی نانتھ اپنے عمل کی اصلاح کر سکتے تھے۔ نہ پھول وتی اپنے طرز عمل کی، اب کے برسوں بول چال بند رہی۔ آخر احباب کے سمجھانے سے دیو کی نانتھ تیسری بار بیوی کو منا لائے۔ مگر اب کے معاملات نے کچھ ایسا طول کھینچا۔ کہ دائمی مفارقت ہو گئی۔ نہ انہوں نے بلایا۔ نہ وہ آئی۔ اور آج میاں شوہر نئی شادی رچا کر اپنے دل کی آگ بجھا رہے ہیں۔ کیا پھول وتی کے لئے بھی یہی آزادی ہے؟ کیا اُسے یہ آزادی ہوتی۔ تو دیو کی نانتھ کو نئی شادی ٹھاننے کا حوصلہ ہوتا؟

دیو کی نانتھ کی ماں صندوق میں زیوروں کو سجا رہی ہیں۔ نئی بہو کی خوشی میں متوالی ہو رہی ہیں۔ اس پر سُن لیا ہے کہ بہو ہوشیار ہے، خدمتگذار ہے۔ شرمیلی ہے۔ پھر کیا پوچھنا، اس لکشمی کے آتے ہی گھر کی رونق ہی کچھ اور ہو جائے گی۔ پڑوسنیں اُسے چڑانے کو کہتی ہیں "نئی بہو جی پڑھی لکھی تو خوب ہوں گی"۔ ساس جی منہ بنا کر کہتی ہیں "مجھے میم صاحب کی ضرورت نہیں۔ در گذری ایسی پڑھی لکھی سے۔ مجھے اب گنوار بہو چاہیئے"

دروازہ سے منشی جی آکر بولے "بھئی! جلدی کرو، گاڑی چھوٹ جائیگی پھر کوئی دوسری ساعت نہیں ہے۔"

ساس کہتی ہے "آپ اپنا کام دیکھئے۔ مجھے کوئی دیر نہیں ہے۔ درزی کو بلوا دیجئے۔ نوشہ کو کپڑے پہنا دے۔"

درزی نے آکر جوڑا پہنایا۔ مالی نے آکر سہرا باندھا۔ چمار نے آکر جوتی پہنائی پھوپھا جی پگڑی سنوار گئے، بوا جی نے آکر آنکھوں میں کاجل لگایا۔ مامی جی نے آکر بندن دار باندھ دی۔ دُلھا آدمی سے بندر بن گیا۔ ۵۴ سال کی عمر، کچھ کچھ بالوں میں سفیدی آچلی تھی۔ دو چار دانت بھی جواب دے چکے تھے، چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئیں۔ مگر وضع ایسی گویا ابھی عنفوان شباب ہے۔"

(۲)

اُدھر پھول وتی کے باپ کو خبر ملی، دریائے تفکر میں ڈوب گئے۔ پہلے سے خبر ہو جاتی تو ہاتھ پاؤں مارتے۔ مگر اب تو برات جانے کو تیار ہے۔ اس تنگ وقت وہ کیا کر سکتے ہیں۔ سوچ رہے تھے۔ ہم لوگوں سے تو نیچی ذاتیں ہی اچھی ہیں۔ اُن کو کم سے کم برادری کا تو خوف ہے۔ ہم لوگوں نے تو بے غیرتی پر کمر باندھ لی ہے۔ ہائے پھول وتی کو معلوم ہوگا۔ تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ آج پندرہ سال گذر گئے۔ اُسے کیا آرام ملا۔ بیواؤں کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس پر یہ نیا صدمہ! یہ نئی چوٹ اس سے برداشت ہوگی؟

پھول وتی اُن آن پر جان دینے والی عورتوں میں تھی جو دل میں ایک بات ٹھان کر پھر پیچھے ہٹنا نہیں جانتیں۔ اگر وہ ذرا سا بھی دب سکتی تو اس کی زندگی آرام سے کٹ جاتی۔ لیکن پندرہ سال کی بے اعتنائی بھی اُس کی خودداری پر فتح نہ پا سکی۔ اُسے جونہی یہ خبر ملی، اُس نے دل میں طے کر لیا یہ شادی

میرے جیتے جی نہیں ہو گی۔ ہرگز نہیں ہو گی تم نئی بہو کے ساتھ زندگی کی بہار نہیں اڑا سکتے۔ اگر میں رو رو کر زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں تو تم کو بھی یونہی جلتے رہنا پڑے گا۔ تم میری چھاتی پر مونگ نہیں دل سکتے۔ اس نے گھر میں کسی سے کچھ نہ کہا۔ والد کو بھی خبر نہ دی۔ آہستہ سے گھر سے نکلی۔ ایک ٹانگہ کرایہ پر لیا۔ اور سسرال چلی۔ راستہ میں سوچتی جاتی تھی۔ آج اس زندگی کا آخری فیصلہ کر دوں گی۔ دکھا دوں گی۔ کہ آج بھی ہندوستان میں ایسی عورتیں ہیں جو اپنی بات کے لئے ہنستے ہنستے جان دے دیتی ہیں، وہ عیش و آرام کے لئے زندہ نہیں رہتیں بلکہ اپنے دھرم کو پالنے کے لئے" اس کی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ کبھی آپ ہی آپ ہنستی کبھی آپ ہی آپ روتی۔ نہ جانے کیا بکتی جاتی تھی۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں شوہر کے مکان سے بہت دور نکل گئی۔ جب ہوش آیا تو ٹانگے والے سے پوچھا:" یہ کونسا محلہ ہے؟" بولا:" یہ کٹڑہ ہے"

"واہ تم یہاں کہاں آ گئے؟ مجھے تو سبزی منڈی جانا ہے"

"تو آپ نے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ اسی طرف سے تو آیا ہوں۔ کیا آپ کو گھر معلوم نہیں؟"

"مجھے خیال نہ تھا"

"کیا سو گئی تھیں۔ مجھے اتنا چکر پڑا"

"بک بک مت کرو۔ ٹانگہ لوٹا لو"

آدھ گھنٹہ میں ٹانگہ دیوکی نائتھ کے دروازے پر جا پہنچا۔

(۳)

برات تیار تھی۔ دولہا پھولوں سے سجے ہوئے موٹر پر بیٹھ چکا تھا، باجے

بج رہے تھے۔ یہ تماشا دیکھ کر پھول وتی کے سینہ پر سانپ سا لوٹنے لگا۔ جی میں آیا۔ کنوئیں میں کود پڑوں تاکہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ جب اپنا کوئی پرساں ہی نہیں، تو اس زندگی سے موت کہیں اچھی۔ پہلے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی ان کی چھاتی پر مونگ دلوں۔ انہیں دکھا کر کسی سے شادی کر لوں۔ پھر دیکھوں، یہ حضرت کیا کر لیتے ہیں میرا۔ مگر اس خیال کو اُس نے دل سے نکال دیا۔ نہیں میں عورتوں کے نام کو داغ نہیں لگاؤنگی اپنے خاندان کو بدنام نہ کروں گی۔ مگر ان حضرات کو برات لے کر جانے نہ دونگی، چاہے میری جان ہی کیوں نہ جائے۔

موٹر نے ہارن بجایا اور چلا ہی چاہتی تھی۔ کہ پھول وتی تانگے سے اُتر پڑی۔ اور آ کر موٹر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

دیو کی ناتھ اُسے دیکھتے ہی جل بھن کر خاک ہو گئے۔ بولے "تم یہاں کیوں آئیں؟ تمہیں یہاں کس نے بُلایا؟"

پھول وتی نے منہ پھیرتے ہوئے کہا "مجھے نیوتنے کی ضرورت نہ تھی"

دیو کی ناتھ "ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا"

پھول وتی "تم شادی کرنے نہیں جا سکتے"

دیو کی ناتھ "مجھے تم روک لوگی؟"

پھول وتی "یا تو روک لونگی یا اپنی جان دے دوں گی"

دیو کی ناتھ۔ "اگر جان دینا چاہتی ہو۔ تو کنوئیں میں کود پڑو۔ یا زہر کھا لو۔ اس پر صبر نہ آئے تو دوسری شادی کر لو، یا کسی کو لے کر نکل جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکتا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ کہ میں زبان تک نہ ہلاؤں گا۔

میرے پیچھے کیوں پڑتی ہو۔ میں نے تمہارے لئے آدھی زندگی تلخ کر دی۔ اب مجھ میں ضبط کی طاقت نہیں ہے۔ میرا کہنا مانو۔ راستہ سے ہٹ جاؤ ورنہ میں موٹر چلا دوں گا۔"

پھول وتی:۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ مجھے پیروں تلے روند کر تم جا سکتے ہو۔"

دیو کی ناتھ:۔ "تم کیا چاہتی ہو۔ میں ساری زندگی تمہارے نام کو روتا رہوں۔ جو عورت اپنے شوہر سے دشمنی کرے۔ اس کی صورت دیکھنا گناہ ہے۔"

پھول وتی:۔ "میں تمہیں اپنی صورت دکھانے نہیں آئی ہوں۔"

دیو کی ناتھ:۔ "تو پھر تریا چرتر کیوں کرتی ہو۔ کیوں نہیں کسی طرف اپنا منہ کالا کر لیتی۔ میں ایسی عورتوں کے چرتر خوب جانتا ہوں۔"

پھول وتی نے خون آب آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ذرا زبان سنبھال کر باتیں کرو، ورنہ میری آہ پڑ جائے گی۔ میں اور سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ تحقیر برداشت نہیں کر سکتی۔"

دیو کی ناتھ نے گردن ہلا کر کہا۔ "ایسی ہی تو بڑی عصمت مآب ہو۔"

پھول وتی:۔ "جو خود بے وفا ہیں۔ انہیں دوسروں سے وفا کی امید رکھنے کا کوئی حق نہیں۔"

دیو کی ناتھ فوراً موٹر پر سے اتر آئے۔ بولے:۔ "سامنے سے ہٹے گی یا نہیں۔"

پھول وتی نے مستقل انداز سے کہا۔ "نہیں۔"

دیو کی ناتھ دانت پیس کر بولے:۔ "ہٹ جا نہیں تو میں کچل دوں گا۔

ساری شیخی دھری رہ جائے گی۔"

پھول وتی: "تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہو کرو، میں نے ایک بار کہہ دیا۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں۔ تحقیر نہیں برداشت نہیں کرسکتی۔"

دیوکی ناتھ: "میں پھر سمجھائے دیتا ہوں کہ ہٹ جا۔ نہیں تو میں کچل دونگا گدھی کہیں کی۔"

پھول وتی: "تو نکال لو دل کا ارمان نا، زبان کیوں خراب کرتے ہو۔ میں دل میں ٹھان کر آئی ہوں۔ کہ میرے جیتے جی تم چین نہ کرنے پاؤ گے۔"

دیوکی ناتھ: "میں نے کہہ دیا تو جاکر کسی سے اپنی شادی کرلے۔ مجھ سے دست برداری لکھا لے، میں نہیں چاہتا کہ تو میرے نام کو روئے۔"

پھول وتی: "میری شادی تو اب بھگوان کے گھر ہوگی۔ لیکن جیتے جی یہ ستم برداشت نہیں کرسکتی۔"

دیوکی ناتھ اب ضبط نہ کرسکے۔ ڈرائیور سے بولے۔ "چلا دو موٹر، جو کچھ ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔ مجھ پر دھونس جمانے چلی ہے۔"

ڈرائیور نے موٹر چلانے سے انکار کیا۔ وہ ایک عورت پر دیدہ و دانستہ موٹر چلاکر اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ زندہ رہیگا تو بھیک مانگ کھائیگا۔ ایسی نوکری اُسے منظور نہیں، وہ موٹر سے اُتر کر چل دیا۔

پھول وتی نے تازیانہ جمایا۔ "تم مجھے موت سے کیا دھمکاتے ہو۔ موت سے وہ ڈرے جسے عیش و آرام کی آرزو ہو۔ یہاں تو مرنے کے لئے تیار ہو کر آئی ہوں، زندہ رہ کر مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ رونے سے جی بھر گیا۔ اب اس کی خواہش نہیں ہے۔"

دیوکی ناتھ کا غصہ طیش کی حد تک جا پہنچا۔ جب انسان کی قوت

تمیز سلب ہو جاتی ہے۔ تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اتنے آدمیوں کے روبرو ایک عورت کے ہاتھوں وہ خفیف نہ ہونا چاہتا تھا۔ سفاکانہ عزم کے ساتھ ہارن بجایا۔

پھول وتی ایک بار چونک پڑی، اور فطری حفظِ بقا کے زیرِ اثر ایک قدم ہٹ گئی۔ مگر فوراً سنبھل کر پھر موٹر کے سامنے آ گئی اور لیٹ گئی۔ اس کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا۔

دوبارہ ہارن بجا۔

پھول وتی نے جنبش نہ کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا دل بیٹھا جاتا ہے۔

موٹر نے تیسری بار ہارن بجایا اور ایک شانِ فرعونیت کے ساتھ چل پڑا۔ ایک چیخ کی آواز سن پڑی اور موٹر آگے نکل گیا۔

پھول وتی کا تنِ نازک زمین پر پڑا ہوا۔ ستار کے چوٹ کھائے ہوئے تاروں کی طرح کانپ رہا تھا۔ جس نے کبھی شوہر کا ایک کلمہ سخت نہیں برداشت کیا۔ وہ آج کیا یہ تحقیر برداشت کر سکتی تھی۔

(۴)

نظارہ اتنا دردناک تھا۔ اتنا نفرت انگیز، اتنا وحشیانہ کہ ہزاروں تماشائیوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اجتماعی ذہنیت ہمیشہ انتہا کی طرف مائل ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ کر گزرتی ہے۔ جو افراد کے لئے ناقابلِ خیال ہے۔ سیلاب اگر آبادیوں کو غرقاب کرتا ہے۔ تو زمین کو زرخیز بھی کرتا ہے۔ دریائے تہ نشین کے سکون میں قوتِ عمل کہاں۔ اس مجمع میں ستمِ ناروا کے خلاف احتجاج کا ایک سیلاب سا آگیا۔ خونِ بیداد انتقام کے

لئے مشتعل ہوگیا۔ قانون پر تصرف اس ذہنیت کی خصوصیت ہے۔ صاحل آدمی ایک اندھے جنون کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے۔ ڈیو کی ناتھ کا ہاتھ پکڑ کر موٹر سے کھینچ لیا۔ اور خونخوار درندوں کی طرح اُس پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ آن واحد میں نوشہ اپنی ساری تمنائیں لئے ایک تودۂ استخوان بنا ہوا خونی سہرا سر پر رکھے زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

دونوں لاشیں آمنے سامنے پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں پر حسرت برس رہی تھی۔ کون قاتل تھا؟ کون مقتول؟

پہر رات گئے دونوں جنازے چلے۔ ڈھول مجیرے کی جگہ آہ و بکا کی گرم بازاری تھی۔ یہ نئی برات تھی۔

دو بیل

جانوروں میں گدھا سب سے بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم کسی شخص کو پہلے درجے کا احمق کہنا چاہتے ہیں تو اُسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بیوقوف ہے، یا اس کی سادہ لوحی اور انتہا درجہ کی قوت برداشت نے اُسے یہ خطاب دلوایا ہے۔ اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ گائے شریف جانور ہے۔ مگر سینگ مارتی ہے۔ کتا بھی غریب جانور ہے۔ لیکن کبھی کبھی اُسے غصہ بھی آجاتا ہے، مگر گدھے کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ جتنا جی چاہے مارلو۔ چاہے جیسی خراب سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو۔ اُس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئیں گے۔ اپریل میں شاید کبھی کلیل کر لیتا ہو، پر ہم نے اُسے کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا، اُس کے چہرہ پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے۔ سُکھ دُکھ نفع نقصان سے کبھی اُسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رشی مُنیوں کی جس قدر خوبیاں ہیں۔ سب اُس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن آدمی اسے بیوقوف کہتا ہے اعلےٰ خصلتوں کی ایسی توہین ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ ممکن ہے۔ دنیا میں سیدھے پن کے لئے جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے۔ جو اس سے کچھ کم ہی گدھا ہے۔ اور وہ ہے بیل۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ

ایسے بھی ہیں۔ جو بیل کو بے وقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں ہے۔ بیل کبھی کبھی مارتا ہے۔ کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے۔ ایک کا نام ہیرا تھا۔ دوسرے کا موتی۔ دونوں پچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت، کام میں چوکس، ڈیل ڈول میں اونچے۔ بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت سی ہو گئی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبانِ خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیونکر سمجھ جاتے تھے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی نہ کوئی ناقابلِ فہم قوت تھی۔ جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ کبھی دونوں سینگ ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں محض زندہ دلی سے، محض ہنسی مذاق سے۔ جیسے یار دوستوں میں کبھی کبھی دھول دھپا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ہلکی سی رہتی ہے۔ جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جاتے اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی۔ کہ زیادہ بوجھ میری گردن ہی پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسا پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اٹھتے، ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے، اور ایک ہی ساتھ

بیٹھتے، ایک منہ ہٹا لیتا تو دوسرا بھی ہٹا لیتا تھا۔

ایک مرتبہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لئے اپنے سسرال بھیجے۔ بیلوں کو کیا معلوم، وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں۔ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا، کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں۔ لیکن جھوری کے سالے کو انہیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے۔ آگے سے پکڑ کر کھینچتا۔ تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے۔ مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے اگر ان بے زبانوں کی زبان ہوتی۔ تو جھوری سے پوچھتے۔ تم نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تمہاری خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تھا۔ تو اور کام لے لیتے۔ ہم کو انکار نہ تھا۔ ہمیں تمہاری خدمت میں مر جانا بھی قبول تھا۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کھلایا، سر جھکا کر کھا لیا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا۔

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں جا پہنچے، دن بھر کے بھوکے تھے۔ لیکن جب ناند میں لگائے گئے۔ تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جسے انہوں نے اپنا گھر سمجھا تھا۔ وہ آج ان سے چھوٹ گیا۔ یہ نیا گھر، نیا گاؤں، نئے آدمی سب انہیں بیگانے لگتے تھے۔ دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے۔ جب گاؤں میں سوتا پڑ گیا۔ تو دونوں نے زور مار کر پگھے تڑا لئے اور گھر کی طرف چلے۔ پگھے بہت مضبوط تھے۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ بیل انہیں توڑ سکیں گے۔ پر ان دونوں میں اس وقت

دُگنی طاقت آ گئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا کہ دونوں بیل چرنی پر کھڑے تھے۔ دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسہ لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ میں بھرے ہوئے تھے۔ اور دونوں کی آنکھوں میں محبت اور ناراضگی جھلک رہی تھی۔ جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے باولا ہو گیا۔ اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے۔ اور تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا۔ مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا۔ کوئی گُڑ۔ کوئی چوکر، کوئی بھوسی۔

ایک لڑکے نے کہا۔ "ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہوں گے"

دوسرے نے تائید کی۔ "اتنی دُور سے دونوں اکیلے چلے آئے"

تیسرا بولا۔ "پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے"

اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا۔ "ہاں بھائی ضرور ہوں گے"

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا۔ تو جل اٹھی بولی۔ "کیسے نمک حرام بیل ہیں۔ ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا۔ بھاگ کھڑے ہوئے"

جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا۔ بولا۔ "نمک حرام کیوں ہیں۔ چارہ دانہ نہ دیا ہوگا۔ تو کیا کرتے"

عورت نے تنک کر کہا۔ "بس تم ہی بیلوں کو کھلانا جانتے ہو۔ اور تو سبھی پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں"

جھوری نے چڑایا "چارہ ملتا تو کیوں بھاگتے "

عورت چڑی "بھاگے اس لئے کہ وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں۔ کھلاتے ہیں تو توڑ کر جوتتے بھی ہیں۔ یہ دونوں ٹھہرے کام چور، بھاگ نکلے۔ اب دیکھتی ہوں کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے۔ خشک بھوسے کے سوائے کچھ نہ دوں گی، کھائیں چاہے مریں "

وہی ہوا مزدور کو کڑی تاکید کر دی گئی کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسا دیا جائے۔ بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا تو پھیکا پھیکا، نہ چکنا ہٹ نہ رس، کیا کھائیں، پُر امید نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

جھوری نے مزدور سے کہا "تھوڑی سی کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا ہے "

مزدور "مالکن مجھے مار ہی ڈالے گی "

جھوری "ڈال دے تھوڑی سی "

مزدور "نہ دادا۔ بعد میں تم بھی انہیں کی سی کہو گے "

(۲)

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا۔ اور بیلوں کو لے چلا۔ اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا۔ دو چار مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا۔ مگر ہیرا نے سنبھال لیا۔ اس وقت دونوں میں قوتِ برداشت زیادہ تھی۔

شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھا اور کل کی شرارت کا مزا چکھایا۔ پھر وہی خشک بھوسہ ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی چونی سب کچھ دیا۔

ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انہیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں مار پڑی،

اس پر خشک بھوسہ۔ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔"

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جوتا۔ پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اٹھانے کی قسم کھالی تھی، وہ مارتے مارتے تھک گیا۔ مگر انہوں نے پاؤں نہ اٹھایا، ایک مرتبہ جب اُس ظالم نے ہیرا کی ناک پر ڈنڈا جمایا۔ تو موتی غصّہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ ہل لے بھاگا۔ ہل رسی۔ جوا جوت سب ٹوٹ کر برابر ہو گئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسیاں نہ ہوتیں۔ تو وہ دونوں نکل گئے تھے۔

ہیرا نے زبان خاموش سے کہا۔" بھاگنا مشکل ہے۔"

موتی نے بھی نگاہوں سے جواب دیا۔" تمہاری تو اُس نے جان لے لی تھی۔ اب کے بڑی مار پڑیگی۔"

ہیرا۔" پڑنے دو۔ بیل کا جنم لیا ہے۔ تو مار سے کہاں بچیں گے۔"

گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آرہا ہے، دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں۔

موتی۔" کہو تو میں بھی دکھا دوں کچھ مزا۔"

ہیرا۔" نہیں بھائی! کھڑے ہو جاؤ۔"

موتی۔" مجھے مارے گا تو میں ایک آدھ کو گرا دوں گا۔

ہیرا۔" یہ ہمارا دھرم نہیں ہے۔"

موتی دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ گیا آپہنچا۔ اور دونوں کو پکڑ کر لے چلا۔

خیریت ہوئی کہ اُس نے اس وقت مارپیٹ نہ کی۔ نہیں تو موتی بھی تیار تھا۔ اُس کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اور اُس کے ساتھی سمجھ گئے۔ کہ اس وقت ٹال جانا ہی مصلحت ہے۔

آج دونوں کے سامنے پھر وہی خشک بھوسہ لایا گیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے۔ اُسی وقت ایک چھوٹی سی

لڑکی دو روٹیاں لئے نکلی۔ اور دونوں کے منہ میں دے کر چلی گئی۔ اس ایک ایک روٹی سے اُن کی بھوک تو کیا مٹتی۔ مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا۔ معلوم ہُوا۔ یہاں بھی کوئی صاحبِ دل ہے۔ لڑکی گیا کی تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ سوتیلی ماں اُسے مارتی رہتی تھی۔ اس لئے ان بیلوں سے اُسے ہمدردی تھی۔

دونوں دن بھر جوتے جاتے۔ اڑتے، ڈنڈے کھاتے، شام کو تھان پر باندھ دیئے جاتے۔ اور رات کو وہی لڑکی اُنہیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی۔ کہ دو چار خشک بھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے۔ مگر دونوں کی آنکھوں کی نس نس میں سرکشی بھری تھی۔

ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا۔ "اب تو نہیں سہا جاتا ہیرا!"

ہیرا۔ "کیا کرنا چاہتے ہو؟"

موتی۔ "گیا کو سینگ پر اٹھا کر پھینک دوں۔"

ہیرا۔ "اگر وہ لڑکی اسی کی بیٹی ہے۔ اسے مار کر گراؤ گے تو وہ یتیم ہو جائے گی۔"

موتی۔ "تو مالکن کو پھینک دوں، وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے۔"

ہیرا۔ "عورت کو مارو گے۔ بڑے بہادر ہو۔"

موتی۔ "تم کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے تو آؤ آج رسا تڑا کر بھاگ چلیں۔"

ہیرا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ایسی موٹی رسی ٹوٹے گی کیونکر؟"

موتی۔ "پہلے رسی کو چبا لو۔ پھر جھٹکا دے کر تڑا لو۔"

رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی، دونوں رسیاں چبانے لگے۔ پر موٹی رسی منہ میں نہ آتی تھی۔ بچارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے۔

معاً گھر کا دروازہ کھلا۔ اور وہی لڑکی نکلی۔ دونوں سر جھکا کر اُس کے ہاتھ چاٹنے لگے۔ دونوں کی دُمیں کھڑی ہو گئیں۔ اُس نے اُن کی پیشانی سہلائی اور بولی۔ "کھول دیتی ہوں، بھاگ جاؤ، نہیں تو یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ آج گھر میں مشہور ہو رہا ہے کہ تمہاری ناک میں ناتھ ڈال دی جائیں۔"

اُس نے دونوں کے رسّے کھول دیئے، پر دونوں چُپ چاپ کھڑے رہے۔

موتی نے اپنی زبان میں پوچھا "اب چلتے کیوں نہیں؟"

ہیرا نے جواب دیا "اس غریب پر آفت آ جائے گی۔ سب اسی پر شبہ کریں گے۔"

یکایک لڑکی چلائی "او دادا! او دادا! دونوں پھوپھا والے بیل بھاگے جا رہے ہیں۔ دوڑو۔ دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں۔"

گیا گھبرا کر باہر نکلا اور بیلوں کو پکڑنے چلا۔ بیل بھاگے۔ گیا نے پیچھا کیا وہ اور بھی تیز ہو گئے۔ گیا نے شور مچایا۔ پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لانے کے لئے لوٹا۔ دونوں بیلوں کو بھاگنے کا موقعہ مل گیا۔ سیدھے دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ راستہ کا خیال نہ رہا۔ جس راہ سے یہاں آئے تھے اس کا پتہ نہ تھا۔ نئے نئے گاؤں ملنے لگے۔ تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

ہیرا نے اپنی زبان میں کہا "معلوم ہوتا ہے راستہ بھول گئے۔"

موتی "تم بھی بے تحاشا بھاگے۔ وہیں اُسے مار گرانا تھا۔"

ہیرا "اُسے مار گراتے تو دُنیا کیا کہتی، وہ اپنا دھرم چھوڑ دے۔ لیکن ہم اپنا دھرم کیونکر چھوڑ دیں۔"

دونوں بھوک سے بے حال ہو رہے تھے۔ کھیت میں مٹر کھڑی تھی۔

چرنے لگے، رہ رہ کر آہٹ لے رہے تھے۔ کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ جب پیٹ بھر گیا۔ اور دونوں کو آزادی کا احساس ہوا تو اُچھلنے کودنے لگے۔ پہلے ڈکار لی پھر سینگ ملائے۔ اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔ موتی نے ہیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک کھائی میں گر گیا۔ تب اُسے بھی غصّہ آیا۔ سنبھل کر اٹھا اور پھر موتی سے لڑنے لگا۔ موتی نے دیکھا۔ کہ کھیل میں جھگڑا ہُوا چاہتا ہے، تو ایک طرف ہٹ گیا۔

(۳)

اَرے یہ کیا! کوئی سانڈ ڈونکتا چلا آتا ہے۔ ہاں سانڈ ہی تو ہے۔ وہ سامنے آپہنچا۔ دونوں دوست تذبذب میں پڑ گئے۔ سانڈ پورا ہاتھی تھا۔ اس سے لڑنا جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ لیکن نہ لڑنے سے بھی جان بچتی نظر نہ آتی تھی۔ اُنہیں کی طرف آرہا تھا۔ کتنا جسیم تھا۔

موتی نے کہا "بُرے پھنسے، جان کیسے بچے گی۔ کوئی طریقہ سوچو۔"

ہیرا نے کہا "غرور سے اندھا ہو رہا ہے۔ منت سماجت کبھی نہ سنیگا۔"

موتی۔ "بھاگ کیوں نہ چلیں؟"

ہیرا۔ "بھاگنا پست ہمت ہے۔"

موتی۔ "تو تم یہیں مرو۔ بندہ تو دو گیارہ ہوتا ہے۔"

ہیرا۔ "اور جو دوڑ آئے تو پھر؟"

موتی۔ "کوئی طریقہ بتاؤ۔ لیکن ذرا جلدی، وہ تو آپہنچا۔"

ہیرا۔ طریقہ یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ حملہ کر دیں۔ میں آگے سے دھکیلوں تم پیچھے سے دھکیلو۔ دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ہوگا۔ جونہی مجھ پر حملہ کرے تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا۔ جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن دوسرا کوئی

طریقہ نہیں۔"

دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے۔ سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا۔ جونہی ہیرا پر جھپٹا۔ موتی نے پیچھے سے ہلہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا تو ہیرا نے ڈھکیلنا شروع کر دیا۔ سانڈ چاہتا تھا۔ ایک ایک کر کے دونوں کو گرا لے۔ پر یہ بھی استاد تھے۔ اُسے یہ موقعہ ہی نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سانڈ جھلا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا تو موتی نے بغل سے آکر اُس کے پیٹ میں سینگ رکھ دیئے۔ بیچارہ زخمی ہو کر بھاگا۔ اور دونوں فتحیاب دوستوں نے دور تک اُس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ سانڈ بے دم ہو کر گر پڑا۔ تب دونوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

دونوں بیل فتح کے نشہ میں جھومتے چلے جاتے تھے۔ موتی نے اپنے اشاروں کی زبان میں کہا "میرا جی تو چاہتا تھا۔ کہ بچہ جی کو مار ہی ڈالوں"

ہیرا۔ "گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ہے"

موتی "یہ سب فضول ہے۔ اگر اُس کا داؤ چلتا تو کبھی نہ چھوڑتا"

ہیرا۔ "اب گھر کیسے پہنچیں گے۔ یہ سوچو"

موتی۔ "پہلے کچھ کھا لیں تو سوچیں۔ ابھی تو عقل کام نہیں کرتی"

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت میں گھس گیا۔ ہیرا منع کرتا ہی رہ گیا۔ لیکن اس نے ایک نہ سُنی۔ ابھی دو ہی چار منہ مارے تھے۔ کہ دو آدمی لاٹھیاں لئے آ گئے اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا۔ ہیرا تو مینڈھ پر تھا نکل گیا۔ موتی کھیت میں تھا۔ اُس کے سُم کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ نہ بھاگ سکا، پکڑا گیا۔ ہیرا نے دیکھا۔ دوست تکلیف میں ہے تو لوٹ پڑا پھنسیں گے تو دونوں پھنسیں گے۔ رکھوالوں نے اُسے

بھی پکڑ لیا۔ دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں تھے۔

(۴)

اُن کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سارا دن گزر گیا۔ اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کیسا مالک ہے۔ اس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ وہاں کئی بھینسیں تھیں، کئی بکریاں، کئی گھوڑے، کئی گدھے، مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا۔ سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے۔ کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ سارے دن دروازہ کی طرف دیکھتے رہے۔ مگر کوئی چارہ لے کر نہ آیا۔ تب غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی۔ مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔

رات کو جب کھانا نہ ملا۔ تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوتے موتی سے بولا "مجھے تو معلوم ہوتا ہے۔ جان نکل رہی ہے"

موتی "اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی! یہاں سے بھاگنے کا کوئی طریقہ سوچو"

ہیرا۔ "آؤ دیوار توڑ ڈالیں"

موتی "مجھ سے تو اب کچھ نہ ہوگا۔

ہیرا "بس اسی بوتے پر اکڑتے تھے"

موتی "ساری اکڑ نکل گئی بھائی!"

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دیئے اور زور مارا تو مٹی کا ایک چپڑ نکل آیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اُس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں۔ ہر ٹکر میں تھوڑی تھوڑی مٹی گرنے لگی۔

اتنے میں کانجی ہوس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آ نکلا۔ ہیرا کی وحشت دیکھ کر اس نے اُسے کئی ڈنڈے رسید کئے۔ اور موتی

سی رسی سے باندھ دیا۔ موتی نے پڑے پڑے اُس کی طرف دیکھا۔ گویا زبان
حال سے کہا: "آخر مار کھائی، کیا ملا؟"

ہیرا۔ "زور تو آزما لیا۔"

موتی۔ "ایسا زور مارنا کس کام کا اور بندھن میں پڑ گئے۔"

ہیرا۔ "اس سے باز نہ آؤں گا۔ خواہ بندھن بڑھتے جائیں۔"

موتی۔ "جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

ہیرا۔ اس کی مجھے پرواہ نہیں۔ یوں بھی تو مرنا ہی ہے۔ ذرا سوچو اگر دیوار
گر جاتی تو کتنی جانیں بچ جاتیں۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں، کسی کے جسم میں
جان ہی نہیں ہے۔ دو چار دن یہی حال رہا۔ تو سب مر جائیں گے۔"

موتی نے بھی دیوار میں اسی جگہ سینگ مارا، تھوڑی سی مٹی گری اور
ہمت بڑھی تو وہ دیوار میں سینگ لگا کر اسی طرح زور کرنے لگا۔ جیسے کسی
سے لڑ رہا ہو۔ آخر کوئی دو گھنٹہ کی قوت آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصہ گر گیا۔
اس نے دگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا کہ نیم جان جانور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں گھوڑیاں
بھاگ نکلیں، بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں
پر گدھے ابھی کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا "تم کیوں نہیں جاتے؟"

ایک گدھے نے کہا "کہیں پھر پکڑ لئے جائیں، تو"

ہیرا۔ "پکڑ لئے جاؤ، پھر دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو موقع ہے"

گدھا۔ "ہمیں ڈر لگتا ہے۔ ہم نہ بھاگیں گے۔"

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے،

بھاگیں یا نہ بھاگیں۔ موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا۔ تو ہیرا نے کہا: "تم جاؤ۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے"۔

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا: "تم مجھے اتنا خود غرض سمجھتے ہو، ہیرا ہم اور تم اتنے دنوں ساتھ رہے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے، تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں"۔

ہیرا۔ "بہت مار پڑے گی۔ سمجھ جائیں گے، یہ تمہاری شرارت ہے"۔

موتی: "جس قصور کے لئے تمہارے گلے میں رسا پڑا ہے۔ اُس کے لئے اگر مجھ پر مار پڑے تو کیا بات ہے۔ اتنا تو ہو گیا۔ کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی"۔

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار باہر نکال دیا۔ اور اپنے دوست کے پاس آ کر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی۔ اور اُسے بھی موٹی رسی سے باندھ دیا گیا۔

(۵)

ایک ہفتہ تک دونوں بیل بندھے پڑے رہے۔ خدا جانے اس کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بیدرد تھے۔ کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا جاتا تھا۔ یہی اُن کی خوراک تھی۔ دونوں اتنے کمزور ہو گئے کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگڈگی بجنے لگی اور دوپہر ہوتے ہوتے

وہاں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے تب دونوں بیل نکالے گئے۔ اور اُن کی دیکھ بھال ہونے لگی۔ لوگ آکر اُن کی صورت دیکھتے تھے۔ اور چلے جاتے تھے، ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا۔

معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور جس کے چہرہ پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے، آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں بیل کانپ اٹھے۔ وہ کون ہے اور انہیں کیوں خریدتا ہے۔ اس کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

ہیرا نے کہا "گیا کے گھر سے ناحق بھاگے، اب جان نہ بچے گی"

موتی نے جواب دیا "کہتے ہیں بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں"۔ انہیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا"

ہیرا "بھگوان کے لئے ہمارا مرنا جینا دونوں برابر ہے"

موتی "چلو اچھا ہے کچھ دن ان کے پاس رہیں گے"

ہیرا "ایک مرتبہ بھگوان نے اُس لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا اب نہ بچائیں گے"

موتی "یہ آدمی چھری چلائے گا، دیکھ لینا"

ہیرا "معمولی بات ہے، مر کر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے"

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اُس آدمی کے ساتھ چلے۔ دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بچارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آہستہ چلتے تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں چرتا نظر آیا۔ سبھی جانور

خوش تھے۔ کوئی اُچھلتا تھا۔ کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پُر مسرت زندگی تھی۔ لیکن کیسے خود غرض تھے۔ کسی کو اُن کی پروا نہ تھی۔ کسی کو خیال نہ تھا کہ اُن کے دو بھائی موت کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

معاً انہیں ایسا معلوم ہُوا کہ یہ رستہ دیکھا ہُوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا۔ ان کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وہی کھیت ہیں، وہی باغ ہیں، وہی گاؤں، اب اُن کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی رفع ہو گئی۔ ارے یہ تو اپنا کھیت آ گیا۔ یہ اپنا کنواں ہے۔ جہاں ہر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کہا "ہمارا گھر نزدیک آ گیا"

ہیرا بولا "بھگوان کی مہربانی ہے"

موتی۔ "میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں"

ہیرا۔ "یہ جانے بھی دے گا۔ اتنا سوچ لو"

موتی "اسے مار گراتا ہوں۔ جب تک سنبھلے تب تک ہم گھر جا پہنچیں گے"

ہیرا "نہیں دوڑ کر تھان تک چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلیں گے"

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازہ پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا، دوسرا پیر۔

اس آدمی نے آ کر بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔ جھوری نے کہا "یہ بیل میرے ہیں، تمہارے کیسے ہیں۔" میں نے نیلام میں لئے ہیں"

جھوری: "میرا خیال ہے پڑا کرائے ہو چپکے سے چلے جاؤ، میرے بیل ہیں میں بیچوں گا تو بکیں گے۔ کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق ہے؟"

"میں نے تو خریدے ہیں۔"

"خریدے ہوں گے۔"

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لئے آگے بڑھا۔ اُسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا اور اُسے ریلتا ہوا گاؤں کے باہر تک لے گیا۔ اور تب اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی دُور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا پتھر پھینکتا تھا، اور موتی اُس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

جب وہ آدمی ہار کر چلا گیا، تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا نے کہا: "میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم اُسے مار نہ بیٹھو۔"

موتی: "اگر نزدیک آتا تو ضرور مارتا۔"

ہیرا۔ "اب نہ آئے گا۔"

موتی: "آئیگا تو دور ہی سے خبر لوں گا۔ دیکھو کیسے لے جاتا ہے۔"

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی۔ بھوسہ، چوکر دانہ سب کچھ بھر دیا گیا دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا اُن کی طرف دیکھتا تھا۔ اور خوش ہوتا تھا بیسیوں لڑکے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سارا گاؤں مُسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اُسی وقت مالکن نے آکر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لئے۔

آخری حیلہ

اگرچہ میرا حافظہ بہت قوی نہیں، تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخیں فراموش ہوگئیں۔ وہ ساری تاریخیں جنہیں راتوں کو جاگ کر جبر ڈال کر یاد کیا تھا۔ مگر شادی کی تاریخ اس ہموار میدان میں ایک ستون کی طرح اٹل ہے، نہ بھولتا ہوں، نہ بھول سکتا ہوں۔ اس سے قبل و مابعد کے سارے واقعات دل سے محو ہوگئے۔ ان کا نشان تک باقی نہیں - وہ ساری کثرت ایک وحدت میں مضمر ہوگئی ہے۔ اور وہ میری شادی کی تاریخ ہے۔ چاہتا ہوں۔ اُسے بھول جاؤں، مگر جس تاریخ کو روزانہ یاد کیا جاتا ہو وہ کیسے بھول جائے اور یاد کیوں کرتا ہوں؟ یہ اُس مبتلائے غم سے پوچھئے جسے نام خدا کے سوا زندگی سے نجات کا کوئی وسیلہ باقی نہ رہا ہو۔

لیکن کیا میں تاہل سے اس لئے بھاگتا ہوں کہ میں زاہد خشک ہوں اور صنف لطیف کی دلربائیوں سے بے اثر؟ کیا میں نہیں چاہتا کہ جب میں سیر کرنے نکلوں تو اہلیہ بھی جلوہ افروز ہوں تکلفات کی دکانوں پر اُن کے ساتھ جاکر تھوڑی دیر کے لئے معشوقانہ التجا کا لطف اٹھاؤں؟ میں اس شان اور مسرت اور غرور کا اندازہ کرسکتا ہوں، جو میرے دوسرے بھائیوں کی طرح میرے دل میں بھی تموج پذیر ہوگا - لیکن میری تقدیر میں

وہ خوشیاں اور رنگ رلیاں نہیں ہیں۔

کیونکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی تو دیکھتا ہوں۔ ایک رُخ جتنا ہی دلفریب اور خوشنما ہے، دوسرا اتنا ہی دل شکن اور ہیبت ناک۔ شام ہوتی اور آپ بچے کو گود میں لئے تیل یا ایندھن والے کی دکان پر کھڑے ہیں۔ اندھیرا ہوا اور آپ آٹے کی پوٹلی بغل میں دبائے گلیوں میں یوں قدم بڑھاتے ہوئے نکل جاتے ہیں، گویا چوری کی ہے۔ صبح ہوئی اور بچوں کو گود میں لئے ہومیوپیتھک ڈاکٹر کی دکان میں ٹوٹی کرسی پر رونق افروز ہیں۔ کسی خوانچے والے کی صدائے نوش آئیں سن کر بچے نے نالۂ فلک رسا بلند کیا۔ اور آپ کی روح قبض ہوتی۔ ایسے باپوں کو بھی دیکھا ہے جو دفتر سے لوٹتے ہوئے پیسے دو پیسے کی مونگ پھلی یا ریوڑیاں لے کر بہ سرعت تمام منہ میں رکھتے چلے جاتے ہیں۔ کہ گھر پہنچتے پہنچتے بچوں کی یورش سے قبل وہ ذخیرہ ختم ہو جائے۔ کتنا مایوس کن ہوتا ہے۔ وہ نظارہ جب دیکھتا ہوں کہ میلے میں بچہ کسی کھلونے کی دکان کے سامنے مچل رہا ہے۔ اور قبلہ گاہی صاحب واعظانہ سرگرمی سے کھلونوں کی بے حقیقتی کا راگ الاپ رہے ہیں۔

تصویر کا پہلا رُخ تو میرے لئے ایک شیریں خواب ہے۔ دوسرا رُخ ایک روح فرسا حقیقت۔ اس حقیقت کے سامنے میرا سارا ذوق تاہل فنا ہو جاتا ہے۔ میری ساری قوت ایجاد میری ساری فکر رسا اسی تاہل کے پھندوں سے بچنے میں صرف ہوتی ہے۔ دانہ تہِ دام ہے، پہچانتا ہوں۔ مگر کتنا گراں، کتنا مہلک! دام خوش رنگ ہے۔ بالکل سنہرے تاروں کا بنا ہوا۔ اس میں طائروں کو تڑپتے اور پھڑپھڑاتے دیکھتا ہوں۔ اور پھر شاخ پر جا بیٹھتا ہوں۔

لیکن ادھر کچھ دنوں سے اہلیہ نے پیہم تقاضے کرنے شروع کئے ہیں کہ مجھے بلالو، پہلے چھٹیوں میں جاتا تھا۔ تو میرا محض "کہاں چلوگی" کہہ دینا اُس کے اطمینانِ قلب کے لئے کافی ہوتا تھا۔ پھر میں نے "فضول ہے" کہہ کر اُسے تسکین دینا شروع کیا۔ اس کے بعد خانہ داری کی پریشانیوں سے تخویف کی۔ مگر اب کچھ دنوں سے اس کی بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے اب میں نے چھٹیوں میں بھی اُس کے تقاضے کے خوف سے گھر جانا بند کردیا ہے۔ کہ کہیں وہ میرے ساتھ نہ چل کھڑی ہو اور انواع و اقسام کے حیلوں سے اُسے ٹرخاتا رہتا ہوں۔

میرا پہلا حیلہ اخبار نویس کی زندگی کی مشکلات سے متعلق تھا۔ بے انتہا تکلیف دہ، کبھی بارہ بجے رات کو سونا نصیب ہوتا ہے کبھی ساری رات لکھنا پڑتا ہے۔ صبح ہوتے ہی دوا دوش۔ وہی ہنگامہ آرائی اُس پر طُرّہ یہ کہ سر پر ایک برہنہ شمشیر لٹکتی رہتی ہے۔ نہ جانے کب گرفتار ہو جاؤں۔ کب ضمانت طلب ہو جائے۔ خفیہ پولیس کی ایک فوج ہمیشہ پیچھے پڑی رہتی ہے۔ کبھی بازار میں نکل جاتا ہوں تو لوگ انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر کہتے ہیں۔ وہ جارہا ہے اخبار والا۔ دنیا میں جتنی آفات ارضی و سماوی آتی ہیں، ملکی و قومی ہیں۔ اُن کا ذمہ وار میں ہوں۔ گویا میرا دماغ جھوٹی خبریں گھڑنے کا کارخانہ ہے۔ سارا دن افسروں کی سلامی اور پولیس کی خوشامد میں گزر جاتا ہے۔ کنسٹیبلوں کو دیکھا اور روح فنا ہوئی۔ کہ خدا جانے کیا آفت برپا کریں۔ میری تو یہ حالت، اور احکام ہیں کہ میری صورت سے ہراساں۔ ایک دن شامتِ اعمال سے کسی انگریز کے بنگلے کی طرف جا نکلا۔ صاحب نے پوچھا، کیا کام کرتا ہے؟ میں نے ایک شان کے ساتھ

کہا، اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ صاحب فوراً اندر گھس گئے۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر میں نے مہم صاحبہ اور باوا لوگوں کو کھڑکیوں سے جھانکتے دیکھا۔ گویا کوئی خطرناک جانور ہے۔ ایک بار ریل گاڑی میں سفر کا اتفاق ہوا۔ ساتھ اور بھی کئی دوست تھے۔ اس لئے اپنے پیشہ کا وقار قائم رکھنے کے لئے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینا پڑا۔ گاڑی میں بیٹھا تو ایک صاحب نے میرے سوٹ کیس پر میرا نام اور پیشہ دیکھتے ہی فوراً اپنا صندوق کھولا۔ اور ریوالور نکال کر میرے روبرو اس میں گولیاں بھریں۔ تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں۔

میں نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر مطلق نہیں کیا۔ کیونکہ میں جنسِ لطیف سے ایسا تذکرہ کرنا اپنی شانِ مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔

مجھے یقین تھا کہ اہلیہ اس خط کے بعد پھر یہاں آنے کے لئے اصرار نہ کریں گی۔ مگر یہ خیال غلط نکلا اور ان کے تقاضے بدستور قائم رہے۔

تب میں نے دوسرا حیلہ سوچا۔ شہروں میں بیماریوں کی گرم بازاری ہے ہر ایک کھانے پینے کی چیزمیں سمیت کا اندیشہ، دودھ میں سمیت گھی کپھلوں میں سمیت، سبزی میں سمیت، ہوا میں سمیت، پانی میں سمیت، یہاں انسان کی زندگی نقش برآب ہے۔ جسے آج دیکھو وہ کل غائب، اچھے خاصے بیٹھے ہیں۔ دل کی حرکت بند، گھر سے سیر کرنے نکلے۔ موٹر سے ٹکر اکر راہئی عدم، اگر کوئی شام کو زندہ سلامت گھر آجائے۔ تو اُسے خوش نصیب سمجھو، مچھر کی آواز کان میں آئی۔ اور دل بیٹھا، مکھی نظر آئی، تو ہاتھ پاؤں پھول گئے، چوہا بل سے نکلا اور جان نکل گئی۔ جدھر دیکھئے ملک الموت، اگر موٹر اور ٹرام سے بچ کر آگئے۔ تو مچھر اور مکھی کے

شکار ہوں، کہاں بچ کر جاؤ گے، بس یہی سمجھ لو۔ موت ہر دم سر پہ کھیلتی رہتی ہے۔ ساری رات مچھروں سے جنگ کرتے گزرتی ہے۔ دن بھر مکھیوں سے لڑتا ہوں، ننھی سی جان کو کن کن دشمنوں سے بچاؤں۔ سانس بھی مشکل سے لیتا ہوں کہ کہیں کوئی تپ کا کیڑا پھیپھڑے میں نہ داخل ہو جائے وغیرہ۔

بیوی کو پھر یقین نہ آیا۔ دوسرے خط میں وہی اصرار موجود تھا لکھا تھا: تمہارے خط نے ایک اور فکر پیدا کر دی۔ اب ہر روز خط لکھا کرنا ورنہ میں ایک نہ سنوں گی اور سیدھی چلی آؤں گی۔ میں نے دل میں کہا چلو سستے چھوٹے۔

مگر یہ فکر لگا ہوا تھا کہ نہ جانے کب انہیں شہر آنے کی سنک سوار ہو جائے۔ اس لئے میں نے ایک تیسرا حیلہ سوچ نکالا۔ یہاں دوستوں کے مارے جان عذاب میں رہتی ہے۔ احباب آ کر بیٹھ جاتے ہیں تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے، گویا اپنا گھر بیچ کر آئے ہیں۔ اگر گھر سے ٹل جاؤ تو آ کر بے محابا کمرہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور نوکر سے سگریٹ، ناشتہ، ادھار منگوا کر کھاتے ہیں۔ دینا مجھے پڑتا ہے۔ بعض تو ہفتوں پڑے رہتے ہیں۔ ٹلنے کا نام ہی نہیں۔ روزانہ ان کی خاطر و مدارات کرو۔ شام کو تھیٹر یا فلم دکھاؤ رات کو ایک دو بجے تک تاش یا شطرنج کھیلو۔ اکثر احباب شراب کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اکثر تو بیمار ہو کر آتے ہیں، بلکہ زیادہ تر بیمار ہی آتے ہیں۔ اب روزانہ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ تیمارداری کرو، رات بھر سرہانے بیٹھے پنکھا جھلتے رہو۔ اکثر آ کر دیکھتا ہوں۔ تو خدمتگار غائب ہے۔ گھنٹوں اس کی تلاش میں گھومتا ہوں۔ تب پتہ چلتا ہے کہ ایک دوست نے

اُسے ذرا ایک کام سے بازار بھیج دیا تھا۔ میری گھڑی مہینوں سے میری کلائی پر نہیں آئی۔ دوستوں کے ساتھ جلسوں میں شریک ہو رہی ہے۔ اچکن ہے وہ ایک صاحب کے پاس، کوٹ دوسرے صاحب لے گئے۔ جوتے ایک اور بابو لے اُڑے۔ میں وہی پرانا کوٹ اور وہی خارج شدہ جوتا پہن کر دفتر جاتا ہوں۔ احباب تاڑتے رہتے ہیں کہ کونسی چیز نئی لایا۔ کوئی چیز لاتا ہوں۔ تو وہ صندوق میں بند پڑی رہتی ہے۔ استعمال کروں تو کسی نہ کسی صاحب کی فرمائش ہو جائے۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے۔ تو چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر آتا ہوں۔ کہ کہیں کوئی صاحب اس لئے میرے منتظر نہ بیٹھے ہوں کہ آج ضرورت ہے۔ کچھ روپے دے دو۔ معلوم نہیں، ان کی ضرورتیں پہلی تاریخ کی منتظر رہتی ہیں۔ ایک دن تنخواہ لے کر بارہ بجے رات کو لوٹا مگر دیکھا اُس وقت بھی دو اصحاب رونق افروز تھے۔ تقدیر ٹھونک لی۔ کتنے ہی بہانے کروں، اُن کے سامنے ایک بھی پیش نہیں جاتی۔ میں کہتا ہوں گھر سے خط آیا ہے۔ والدہ صاحبہ بہت بیمار ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں۔ ابھی بوڑھے اتنی جلد نہیں مرتے۔ مرنا ہی ہوتا تو اتنے دنوں زندہ ہی کیوں رہتیں۔ دیکھ لینا دو چار روز میں اچھی ہو جائیں گی۔ کہتا ہوں، ارے یار گھر سے بہت ضروری خط آیا ہے، مال گزاری کا سخت تقاضا ہو رہا ہے۔ جواب ملتا ہے۔ آج کل تو لگان بندی ہو رہی ہے۔ اور تمہیں بھی اس کی تقلید کرنی چاہیئے۔ اگر کسی تقریب کا حیلہ کرتا ہوں۔ تو فرماتے ہیں، تم بھی کیا عجیب الخلقت انسان ہو۔ ان بیہودہ مراسم کی پابندی کرنا تمہاری شان کے خلاف ہے۔ اگر تم ان مراسم کی بیخ کنی نہ کرو گے۔ تو وہ لوگ کیا آسمان سے آئیں گے۔ خاموش ہو جاتا ہوں۔ کہ یہ کسی طرح گلا نہ چھوڑیں گے پھر

کیوں مفت میں سر پچی کروں۔

مجھے یقین تھا کہ اس خط کے بعد بیوی پھر یہاں آنے کا نام نہ لے گی۔ مگر اب کی پھر وہ خیال غلط نکلا۔ جواب میں وہی تقاضا تھا۔ خیریت اتنی ہوئی کہ انہوں نے خط لکھنے پر ہی اکتفا کی۔

تب میں نے چوتھا حیلہ سوچا۔ یہاں کے مکان ہیں کہ خدا کی پناہ! نہ ہوا، نہ روشنی، نہ وسعت، اعراض ثلاثہ کا کہیں پتہ نہیں، وہ غضب کا تعفن کہ دماغ پھٹا جاتا ہے۔ کتنوں کو تو اسی تعفن کے باعث مالیخولیا، اختلاج قلب، ضیق النفس یا ٹائیفائیڈ ہو جاتا ہے۔ بارش ہوئی اور مکان ٹپکنا شروع ہوا۔ پانی ادھر گھنٹہ برسے مکان رات بھر رستا رہتا ہے۔ رات بھر مکانوں کے گرنے کی صدا آتی رہتی ہے۔ صبح کو اٹھو۔ تو کوئی یہاں ملبہ میں مدفون ہے کوئی وہاں، رات کو وحشت ہوتی ہے۔ ایسے بہت کم مکان ہوں گے جن میں پلید ارواح کا گذر نہ ہو۔ ہولناک خواب دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ رات کو رو پڑتے ہیں، چیخ اٹھتے ہیں۔ کتنے ہی جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج گھر میں آئے، کل مکان تبدیل کرنے کی فکر پیدا ہو گئی۔ کوئی ٹھیلہ اسباب سے لدا جا رہا ہے۔ کوئی آ رہا ہے۔ بس جدھر دیکھئے، ٹھیلے ہی ٹھیلے نظر آتے ہیں۔ چوریاں تو اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اگر کوئی رات خیریت سے گزر جائے۔ تو دیوتاؤں کی منت مانی جاتی ہے۔ آدھی رات ہوئی۔ اور چور چور، لینا لینا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لوگ دروازوں پر موٹے موٹے لکڑی کے چھڑے یا جوتے یا دست پناہ یا چولہا قدمی کی چھڑی لئے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر بھی چور اتنے شاطر ہیں کہ نظر بچا کر اندر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایک میرے لئے تکلف دوست ہیں۔ رات اندھیرے میں برتن کھڑکے، تو

میں نے بجلی کی بتی جلائی۔ دیکھا تو وہی حضرت برتن سمیٹ رہے ہیں۔ مجھے جاگتے دیکھ کر زور سے قہقہہ مارا اور بولے "میں تجھے چکمہ دینا چاہتا تھا۔" میں نے دل میں سمجھ لیا کہ اگر نکل جاتے تو برتن آپ کے تھے۔ جاگ آ گئی۔ تو چکمہ ہو گیا۔ گھر میں آئے کیسے تھے، یہ معمہ ہے۔ غالباً رات کو تاش کھیل کر چلے تو باہر جانے کے بدلے نیچے اندھیری کوٹھڑی میں چھپ گئے۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے خط لکھوانے آئے۔ شامت اعمال کمرہ میں قلم دوات نہ تھی۔ اوپر کے کمرہ سے لانے گیا۔ لوٹ کر آیا تو دیکھا حضرت غائب ہیں۔ اور اُن کے ساتھ گھڑی بھی غائب ہے۔

مگر میری بیوی پر شہری زندگی کا ایسا جادو چڑھا ہوا ہے کہ میرا کوئی حیلہ اُسے خائف نہیں کرتا۔ اس خط کے جواب میں اُس نے لکھا "تم مجھ پر بہانے کرتے ہو اور خود وہاں سیر سپاٹے کا لطف اُٹھاتے ہو۔ میں ہرگز نہ مانوں گی، اگر مجھے لے جاؤ۔"

آخر مجھے پانچواں حیلہ کرنا پڑا۔ یہ خوانچے والوں کے متعلق تھا۔ ابھی بستر سے اٹھنے کی نوبت نہیں آئی۔ کہ کانوں میں عجیب وغریب صدائیں آنے لگیں۔ شاید بابل کے منار کی تعمیر کے وقت بھی ایسی ہی گوناگون مہمل صدائیں آتی ہوں گی۔ یہ خوانچے والوں کی صدائے بے ہنگام ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یہ سب نغمہ و چنگ کے ساتھ اپنی چیزوں کی جانب لوگوں کو مائل کرتے۔ یہاں کے موسیقی کالج میں چار پانچ سال اس ہنر کو حاصل کرتے۔ مگر ان اوندھی عقل والوں کو یہ کیا سوجھتی ہے۔ اس طرح شیطانی صدائیں نکالتے ہیں۔ کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اور

بچے ماں کی گود سے چمٹ جاتیں۔ میں بھی تو راتوں کو اکثر چونک پڑتا ہوں
ایک روز تو میرے پڑوس میں ایک سانحہ ہو گیا۔ گیارہ بجے تھے۔ کوئی
خاتون شاید بچے کو دودھ پلانے اٹھی تھیں۔ یکایک جو کسی خوانچے والے
کی صدائے مہیب کانوں میں آئی تو چیخ مار کر چلا اٹھیں اور پھر بے ہوش
ہو گئیں۔ مہینوں کی دوا دارو کے بعد صحت ہوئی۔ اب رات کو کانوں
میں روئی ڈال کر سوتی ہیں۔ ہرچند کہا گیا کہ خوانچے والے کی صدا تھی۔
پر انہیں یقین نہیں آتا۔ اور ایسے سانحے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔
کئی احباب اپنی بیویوں کو لائے۔ مگر بے چاریاں دوسرے ہی دن ان
صداؤں سے خائف ہو کر واپس چلی گئیں۔

مگر اہلیہ نے اسے بھی میرا حیلہ ہی سمجھا۔ "تم سمجھتے ہو، میں خوانچے
والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔ یہاں گیدڑوں کا ہوا ہونا اور الوؤں
کا شور سن کر تو ڈرتی نہیں۔ خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔
مجھے ایسی باتوں سے نہ ڈرائیے۔"

آخر میں نے اب کی کوئی ایسا حیلہ سوچ نکالنے کی ٹھانی، جو اس
خوف کا یک لخت خاتمہ کر دے۔ اہلیہ صاحبہ کو شہری زندگی سے مدت العمر
کے لیے نفرت ہو جائے۔ کئی دنوں کے بعد مجھے ایک حیلہ سوجھا۔ اگرچہ
اس میں کچھ رسوائی کا بھی اندیشہ تھا۔ لیکن رسوائی ہو جانے کا کوئی غم نہیں
وہ مصیبت تو سر پر نہ پڑے۔

میں نے لکھا کہ یہ شریف زادیوں کے رہنے کی جگہ نہیں، یہاں کی مہریاں
اتنی بدزبان ہیں کہ باتوں کا جواب گالیوں سے دیتی ہیں، اور ان کی وضع
قطع کا کیا پوچھنا۔ شریف زادیاں تو ان کا ٹھاٹھ دیکھ کر شرم سے پانی پانی

ہو جاتی ہیں۔ سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہوئی سامنے سے نکل جاتی ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے خوشبو کی لپیٹ نکل گئی۔ کوئی شریف عورت یہ ٹھاٹھ کہاں سے لائے، اُسے تو اور بھی سینکڑوں فکر ہیں۔ انہیں تو بناؤ سنوار کے سوا دوسرا کام ہی نہیں، روز نئی سج دھج، نت نئی ادا اور شوخ تو اس غضب کی ہیں۔ کہ گویا سیماب بھر دیا گیا ہو۔ ان کا چمکنا اور مٹکنا، بجانا اور مسکرانا دیکھ کر بیچاری بھلے گھروں کی عورتیں شرما جاتی ہیں۔ اور ایسی گستاخ ہیں کہ خواہ مخواہ گھروں میں گھس پڑتی ہیں۔ کہیں کسی دوست کے گھر سے کوئی چیز لے کر کبھی کسی دوسرے بہانہ سے کوئی کتنا ہی چاہے کہ ان سے آنکھیں چار نہ ہوں۔ مگر غیر ممکن۔ جدھر دیکھو ان کا میلہ سا لگا ہوا ہے۔ اجی اکثر تو خط لکھانے کے بہانے سے گھروں میں آ جاتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ گھر والیوں کو جلاتی ہیں۔

معلوم نہیں، اس خط میں مجھ سے کون سی غلطی ہو گئی کہ تیسرے ہی دن اہلیہ محترمہ ایک بوڑھے کہار کے ساتھ میرا پتہ پوچھتی ہوئی اپنے تینوں بچوں کو لئے ایک بلا کے جیسے درباں کی طرح وارد ہو گئیں۔

میں نے بدحواس ہو کر پوچھا "کیوں خیریت تو ہے؟"

اہلیہ نے چادر اُتارتے ہوئے کہا "گھر میں کوئی چڑیل بیٹھی تو نہیں ہے؟ یہاں کسی نے قدم رکھا۔ تو ناک ہی کاٹ لوں گی۔ ہاں جو تمہاری شہ نہ ہو"

اچھا تو اب عقدہ کھلا میں نے سر پیٹ لیا۔ کیا جانتا تھا، اپنا طمانچہ اپنے ہی منہ پر پڑے گا۔

٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭

نجات

دُکھی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا۔ اور اُس کی بیوی جھُریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے۔ تو چمارن نے کہا ”تو جاکر پنڈت بابا سے کہہ آؤ، ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں۔“

دُکھی: ”ہاں جاتا ہوں، لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟“

جھُریا: ”کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائیگی۔ ٹھکرانی سے مانگ لانا۔“

دُکھی: ”تو تو کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دیں گے۔ جاکر ایک لوٹا پانی مانگوں تو نہ ملے۔ بھلا کھٹیا کون دے گا۔ ہمارے اوپلے۔ ایندھن، بھوسا، لکڑی تھوڑے ہی ہیں کہ جو چاہے اٹھا لے جائے۔ اپنی کھٹولی دھو کر رکھ دے گرمی کے تو دن ہیں۔ اُن کے آتے آتے سوکھ جائے گی۔“

جھُریا: ”ہماری کھٹولی پر وہ نہ بیٹھیں گے۔ دیکھتے نہیں کتنے نیم دھرم سے رہتے ہیں۔“

دُکھی نے کسی قدر مغموم لہجہ میں کہا: ”ہاں یہ بات تو ہے۔ مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتّل بنا لوں۔ تو ٹھیک ہو جائے۔ پتّل میں بڑے آدمی کھاتے ہیں، وہ پاک ہے، لا تو لاٹھی، پتے توڑ لوں“

جھُریا: ”پتّل میں بنا لوں گی، تم جاؤ۔ لیکن ہاں انہیں سیدھا بھی جاتے

اور تھالی بھی چھوٹے بابا۔ تھالی اٹھا کر پٹک دیں گے۔ وہ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں۔ غصہ میں پنڈتانی تک کو بھی نہیں چھوڑتے۔ لڑکے کو ایسا پیٹا کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لئے پھرتا ہے۔ پتّل میں سیدھا بھی دے دینا مگر چھونا مت۔ بھوری گونڈ کی لڑکی کو لے کر شاہ کی دکان سے چیزیں لے آنا۔ سیدھا بھرپور سیر بھر آٹا، آدھ سیر چاول، پاؤ بھر دال، آدھ پاؤ گھی۔ نمک ہلدی اور پتّل میں ایک کنارے چار آنہ کے پیسے رکھ دینا گونڈ کی لڑکی نہ ملے، تو بھرجن کے ہاتھ پیر جوڑ کر لے آنا تم کچھ نہ چھونا ورنہ غضب ہو جائے گا"

ان باتوں کی تاکید کر کے دکھی نے لکڑی اُٹھالی۔ اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا۔ خالی ہاتھ باباجی کی خدمت میں کس طرح جاتا۔ نذرانے کے لئے اُس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا۔ اُسے خالی دیکھ کر تو باباجی دور ہی سے دھتکار دیتے۔

(۲)

پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ نیند کھلتے ہی ایشور اُپاسنا میں لگ جاتے۔ منہ ہاتھ دھوتے دھوتے آٹھ بجتے تب اصلی پوجا شروع ہوتی، جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے، پھر آئینے کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تلک لگاتے۔ چندن کے متوازی خطوں کے درمیان لال روئی کا ٹیکہ ہوتا ہے، پھر سینہ پر، دونوں بازوؤں پر چندن کے گول گول دائرے بناتے اور ٹھاکر جی کی مورتی نکال کر اُسے نہلاتے۔ چندن لگاتے، پھول چڑھاتے، آرتی کرتے اور گھنٹی بجاتے۔ دس بجتے بجتے وہ

پُوجن سے اُٹھتے اور بھنگ چھان کر باہر آتے۔ اُس وقت دو چار ججمان دروازے پر آجاتے۔ ایشور اُپاسنا کا فی الفور پھل مل جانا یہی اُن کی کھیتی تھی۔

آج وہ عبادت خانے سے نکلے، تو دیکھا دُکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لیے بیٹھا ہے، انہیں دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور نہایت ادب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا پُر جلال چہرہ دیکھ کر اُس کا دل عقیدت سے پُر ہو گیا۔ کتنی تقدس تاب صورت تھی۔ چھوٹا سا گول مول آدمی، چکنا سر، پھولے ہوئے رخسار، روحانی جلال سے منور آنکھیں اس پر رولی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدیس عطا کر دی تھی۔ دُکھی کو دیکھ شیریں لہجے میں بولے: "آج کیسے چلا آیا رے دُکھیا؟"

دُکھی نے سر جھکا کر کہا: "بیٹا کی سگائی کر رہا ہوں۔ مہاراج ساعت شگن بچارنا ہے۔ کب مرجی ہو گی؟"

گھاسی: "آج تو مجھے چھٹی نہیں ہے، شام تک آجاؤں گا۔"

دُکھی: "نہیں مہاراج! جلدی، مرجی ہو جائے، سب سامان ٹھیک کر آیا ہوں، یہ گھاس کہاں رکھ دوں؟"

گھاسی: "اس گائے کے سامنے ڈال دے، اور ذرا جھاڑو لے کر دروازہ تو صاف کر دے۔ یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی، اسے بھی گوبر سے لیپ دے۔ تب تک میں بھوجن کر لوں، پھر ذرا آرام کر کے چلوں گا، ہاں یہ لکڑی بھی چیر دینا۔ کھلیان میں چار کھانچی بھوسہ پڑا ہے۔ اسے بھی اٹھا لانا اور بھوسیلے میں رکھ دینا۔"

دُکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ دروازے پر جھاڑو لگائی، بیٹھک

کو گوبر سے لیپا، اُس وقت بارہ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے گئے
دُکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا، اُسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن
وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا؟ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے
چلا جائے۔ تو پنڈت جی بگڑ جائیں۔ بیچارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑنے
لگا۔ لکڑی کی موٹی سی گرہ تھی۔ جس پر کتنے ہی بھگتوں نے اپنا زور آزما
لیا تھا۔ وہ اُسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا کے لئے تیار تھی۔ دُکھی
گھاس چھیل کر بازار لے جاتا۔ لکڑی چیرنے کا اُسے محاورہ نہ تھا۔ گھاس
اُس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا دیتی تھی۔ یہاں کس کس کر کلہاڑی
کا بھرپور ہاتھ جماتا۔ لیکن اس گرہ پر نشان تک نہ پڑتا تھا۔ کلہاڑی اُچٹ
جاتی۔ پسینہ سے تر تھا، ہانپتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا، پھر اٹھتا تھا، ہاتھ
اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے، کمر سیدھی نہ ہوتی تھی،
آنکھوں تلے اندھیرا ہو رہا تھا۔ سر میں چکر آ رہے تھے۔ ہوائیاں اڑ رہی
تھیں، پھر بھی اپنا کام کئے جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا، تو
شاید کچھ طاقت آتی، اُس نے سوچا، یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملے گی۔
برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سب نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑا
ہی پیتے ہیں۔ یکایک اُسے یاد آیا کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے۔
اس کے ہاں ضرور چلم تمباکو ہوگی۔ فوراً اُس کے گھر دوڑا۔ خیر محنت سپھل
ہوئی۔ اُس نے تمباکو اور چلم بھی دی۔ لیکن آگ وہاں نہ تھی۔ دُکھی نے
کہا: "آگ کی فکر نہ کرو بھائی! پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لوں گا۔
وہاں تو ابھی رسوئی بن رہی تھی۔"

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لے کر چلا آیا۔ اور پنڈت جی کے گھر میں

دالان کے دروازہ پر کھڑا ہو کر بولا "مالک ذرا سی آگ مل جائے۔ تو چلم پی لیں"

پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے۔ پنڈتانی نے پوچھا "یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے؟"

"ارے وہی سسرا دکھیا چمار ہے، کہا ہے تھوڑی سی لکڑی چیر دے، آگ ہے تو دے دو۔"

پنڈتانی نے بھویں چڑھا کر کہا "تمہیں تو جیسے پوتھی پترے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ بھی نہ رہی۔ چمار ہو، دھوبی ہو، پارسی ہو، منہ اٹھائے گھر میں چلے آئے، پنڈت کا گھر نہ ہوا کوئی سرائے ہوئی، کہہ دو کہ ڈیوڑھی سے چلا جائے۔ ورنہ اسی آگ سے منہ جھلس دوں گی۔ بڑے آگ مانگنے چلے ہیں۔"

پنڈت جی نے انہیں سمجھا کر کہا "اندر آگیا تو کیا ہوا۔ تمہاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی، زمین پاک ہے۔ ذرا سی آگ کیوں نہیں دے دیتیں۔ کام تو ہمارا ہی کر رہا ہے۔ کوئی لکڑ ہارا یہی لکڑی پھاڑتا۔ تو کم از کم چار آنے لیتا۔"

پنڈتانی نے گرج کر کہا "وہ گھر میں آیا ہی کیوں؟"

پنڈت نے ہار کر کہا "سسرے کی بدقسمتی تھی اور کیا؟"

پنڈتانی "اچھا اس وقت تو آگ دیئے دیتی ہوں۔ لیکن پھر جو اس گھر میں آئے گا۔ تو منہ جھلس دوں گی۔"

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی۔ بیچارہ پچھتا رہا تھا، ناحق آیا۔ سچ تو کہتی ہیں۔ پنڈت کے گھر چمار کیسے چلا آئے، یہ لوگ

پاک صاف ہوتے ہیں۔ تب ہی تو اتنا مان ہے۔ پر چمار بھو ٹرے ہی ہیں اسی گاؤں میں بوڑھا ہو گیا۔ مگر مجھے اتنی اکل (عقل) بھی نہ آئی۔ اسی لئے جب پنڈتانی جی آگ لے کر نکلیں تو جیسے اُسے جنّت مل گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکاتا ہوا بولا۔ "پنڈتانی ماتا! مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ گھر سے چلا آیا۔ چمار کی اکل (عقل) ہی تو ٹھہری، اتنے مورکھ نہ ہوتے تو سب کی لات کیوں کھاتے۔"

پنڈتانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی۔ اُنہوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر گھونگھٹ کی آڑ سے دُکھی کی طرف آگ پھینکی۔ ایک بڑی سی چنگاری اس کے سر پر پڑ گئی۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر جھاڑنے لگا۔ اُس کے دل نے کہا۔ یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے۔ بھگوان نے کتنی جلدی سزا دے دی۔ اسی لئے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے۔ اور سب کے روپئے مارے جاتے ہیں۔ برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں گل گل کر گرنے لگیں۔

باہر آکر اُس نے چلم پی اور کلہاڑی لے کر مستعد ہو گیا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ سر پر آگ پڑ گئی۔ تو پنڈتانی کو کچھ رحم آگیا۔ پنڈت جی کھانا کھا کر اُٹھے تو بولیں۔ "اس چمرا کو بھی کچھ کھانے کو دیدو۔ بے چارا کب سے کام کر رہا ہے، بھوکا ہوگا۔"

پنڈت جی نے اس تجویز کو فنا کر دینے کے ارادے سے پوچھا۔ "روٹیاں ہیں؟"

پنڈتانی۔ "دو چار بچ جائیں گی۔"

پنڈت۔ "دو چار روٹیوں سے کیا ہوگا؟ یہ چمار ہے۔ کم از کم سیر بھر

چڑھا جائے گا۔"

پنڈتائنی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں "ارے باپ رے! سیر بھر! تو پھر رہنے دو۔"

پنڈت جی نے اب شیر بن کر کہا "کچھ بھوسی چوکر ہو تو آٹے میں ملا کر موٹی موٹی روٹیاں توے پر ڈال دو، سالے کا پیٹ بھر جائیگا۔ پتلی روٹیوں سے ان کمینوں کا پیٹ نہیں بھرتا، انہیں تو جوار کا موٹا سا ٹکر چاہیئے۔"

پنڈتائنی نے کہا "اب جانے بھی دو، دھوپ میں مرے۔"

(۳)

دکھی نے چلم پی کر کلہاڑی سنبھالی۔ دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آگئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا۔ پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اتنے میں وہی گونڈ آگیا بولا "بوڑھے دادا! جان کیوں دیتے ہو۔ تمہارے پھاڑے یہ گانٹھ نہ پھٹے گی، ناحق ہلکان ہوتے ہو۔"

دکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا "بھائی ابھی گاڑی بھر بھوسہ ڈھونا ہے۔"

گونڈ "کچھ کھانے کو بھی دیا یا کام ہی کروانا جانتے ہیں۔ جا کے مانگتے کیوں نہیں؟"

دکھی۔ "تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، بھلا باہمن کی روٹی ہم کو پچے گی۔"

گونڈ "پچنے کو تو پچ جائے گی۔ مگر ملے تو۔ خود تو مونچھوں پر تاؤ دے کر کھانا کھایا اور آرام سے سو رہے ہیں۔ تمہارے لئے لکڑی پھاڑنے کا حکم لگا دیا زمیندار کبھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ حاکم بھی بیگار لیتا ہے تو تھوڑی بہت

مزدوری دے دیتا ہے، یہ اُن سے بھی بڑھ گئے اس پر دھرماتما بنتے ہیں"

دُکھی نے کہا "بھائی آہستہ آہستہ بولو۔ کہیں سُن لیں گے تو بس!"

یہ کہہ کر دُکھی پھر سنبھل پڑا اور کلہاڑی چلانے لگا۔

گونڈ کو اس پر رحم آگیا۔ کلہاڑی ہاتھ سے چھین کر تقریباً نصف گھنٹہ تک جی توڑ کر چلاتا رہا۔ لیکن گانٹھ پر ذرا بھی نشان نہ ہُوا۔ بالآخر اُس نے کلہاڑی پھینک دی اور یہ کہہ کر چلا گیا "یہ تمہارے پھاڑے نہ پھٹے گی۔ خواہ تمہاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے"

دُکھی سوچنے لگا۔ یہ گانٹھ اُنہوں نے کہاں سے رکھ چھوڑی تھی، کہ پھاڑے نہیں پھٹتی۔ میں کب تک اپنا خون پسینہ ایک کروں گا۔ ابھی گھر پر سو کام پڑے ہیں۔ کام کاج والا گھر ہے۔ ایک نہ ایک چیز گھٹتی رہتی ہے۔ مگر اُنہیں اُن کی کیا فکر؟ چلوں جب تک بھوسہ ہی اکٹھا لاؤں۔ کہہ دوں گا آج تو لکڑی نہیں پھٹی۔ کل آکر پھاڑ دوں گا"

اس نے ٹوکرا اٹھایا اور بھوسہ ڈھونے لگا۔ کھلیان یہاں سے دو فرلانگ سے کم نہ تھا۔ اگر ٹوکرا خوب بھر بھر کر لاتا تو کام جلد ہو جاتا۔ مگر سر پر اٹھاتا کون؟ خود اس سے اُٹھ نہ سکتا تھا۔ اس لئے تھوڑا تھوڑا لاتا تھا۔ چار بجے کہیں بھوسہ ختم ہُوا، پنڈت جی کی نیند بھی کھُلی۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ پان کھایا۔ اور باہر نکلے۔ دیکھا تو دُکھی ٹوکرے پر سر رکھے سو رہا ہے۔ زور سے بولے۔ "ارے دکھیا تو سو رہا ہے، لکڑی تو ابھی جوں کی توں پڑی ہوئی ہے، اتنی دیر تو کیا کرتا رہا۔ مٹھی بھر بھوسہ اُٹھانے میں شام کردی، اس پر سو رہا ہے کلہاڑی اٹھالے اور لکڑی پھاڑ ڈال۔ تجھ سے ذرا بھر لکڑی بھی نہیں پھٹی پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی۔ مجھے دوش مت دینا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں

کہ جہاں بیچ کے گھر کھانے کو ہُوا، اس کی آنکھ بدل جاتی ہے ؟"

دُکھی نے پھر کلہاڑی اُٹھائی جو باتیں اُس نے پہلے سوچ رکھی تھیں وہ سب بھُول گیا، پیٹ پیٹھ میں دھنسا جاتا تھا، آج صبح ناشتہ تک نہ کیا تھا، فرصت ہی نہ ملی۔ اُٹھنا بیٹھنا تک پہاڑ معلوم ہوتا تھا، دل ڈوبا جاتا تھا، پر دل کو سمجھا کر اُٹھا، پنڈت ہیں کہیں ساعت ٹھیک نہ بچاریں تو پھر ستیاناس ہو جائے جب ہی تو ان کا دنیا میں اتنا مان ہے، ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے جسے چاہے بنا دیں جسے چاہیں بگاڑ دیں۔ پنڈت جی گانٹھ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور حوصلہ افزائی کرنے لگے "ہاں مار کس کے، اور مار، کس کے مار، ایسے زور سے مار، تیرے ہاتھ میں تو جیسے دم ہی نہیں ہے۔ لگا کس کے، ٹکڑا کھڑا سوچنے کیا لگتا ہے، ہاں بس پھٹا ہی چاہتی ہے، اسی سوراخ میں؟"

دُکھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ نہ معلوم کوئی غیبی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی، تکان، بھوک، پیاس، کمزوری سب کے سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں، اُسے اپنے قوت بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی، آدھے گھنٹے تک وہ اسی طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا۔ حتی کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی۔ اور دکھی کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی اسکے ساتھ ہی وہ بھی چکر کھا کر گر پڑا، بھوکا پیاسا، تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔

پنڈت جی نے پکارا، "اٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے۔ پتلی پتلی چیلیاں ہو جائیں۔ دُکھی نہ اُٹھا۔ پنڈت جی نے اب اُسے دق کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اندر جا کر بُوٹی چھانی، حاجات ضروری سے فارغ ہوئے۔ نہایا اور پنڈتوں کا لباس پہن کر باہر نکلے، دُکھی ابھی تک وہیں پڑا ہُوا تھا۔ زور سے پکارا۔ ارے دُکھی کیا پڑے ہی رہو گے؟ چلو تمہارے ہی گھر چل رہا ہوں، سب سامان

ٹھیک ہے نا؟ دُکھی پھر بھی نہ اٹھا۔

اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہُوا پاس جاکر دیکھا، تو دکھی اکڑا ہُوا پڑا تھا، بدحواس ہوکر بھاگے اور پنڈتانی سے بولے "دُکھیا تو جیسے مر گیا"

پنڈتانی جی تعجب انگیز لہجہ میں بولیں "ابھی تو لکڑی چیر رہا تھا نا!"

"ہاں لکڑی چیرتے چیرتے مر گیا، اب کیا ہوگا؟"

پنڈتانی نے مطمئن ہوکر کہا "ہوگا کیا چمرونے میں کہلا بھیجو مردہ اٹھا لے جائیں"

دم کے دم میں یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں میں زیادہ تر برہمن ہی تھے صرف ایک گھر گونڈ کا تھا، لوگوں نے ادھر کا راستہ چھوڑ دیا، کنوئیں کا راستہ ادھر ہی سے تھا، پانی کیونکر بھرا جائے۔ چمار کی لاش کے پاس ہوکر پانی بھرنے کون جائے۔ ایک بڑھیا نے پنڈت جی سے کہا "اب مردہ کیوں نہیں اُٹھوانے، کوئی گاؤں میں پانی پئے گا یا نہیں؟"

ادھر گونڈ نے چمرونے میں جاکر سب سے کہہ دیا "خبردار! مردہ اُٹھانے مت جانا ابھی پولیس کی تحقیقات ہوگی، دل لگی ہے کہ ایک غریب کی جان لیلی، پنڈت ہونگے تو اپنے گھر کے ہونگے، لاش اُٹھا لاؤ گے، تو تم بھی پکڑے جاؤ گے"

اُس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے، پر چمرونے میں کوئی آدمی لاش اٹھالانے کو تیار نہ ہُوا، ہاں دُکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں اور پنڈت جی کے دروازے پر آکر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں، اُن کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں کوئی روتی تھی، کوئی سمجھاتی تھیں، پر چمار ایک بھی نہ تھا، پنڈت جی نے اُن سب کو بہت دھمکایا سمجھایا، منت کی پر چماروں کے دل پر پولیس کا رعب چھایا کہ ایک بھی من نہ سکا، آخر ناامید ہوکر لوٹ آئے۔

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہو گیا، مگر لاش اٹھانے کوئی چمار نہ آیا، اور برہمن چمار کی لاش کیسے اٹھاتے۔ بھلا ایسا کسی شاستر پوران میں لکھا ہے کہیں کوئی دکھا دے۔

پنڈتائنی نے جھنجھلا کر کہا "ان ڈائنوں نے تو کھوپری چاٹ ڈالی۔ سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا"

پنڈت نے کہا "چڑیلوں کو رونے دو، کب تک روئیں گی، جیتا تھا تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا، مر گیا تو شور و غل مچانے کے لئے سب کی سب آپہنچیں"

پنڈتائنی "چماروں کا رونا منحوس ہے" پنڈت "ہاں بہت منحوس"

پنڈتائنی "ابھی سے بو آنے لگی" پنڈت "چمار تھا سسرا کہیں کا، ان سبھوں کو کھانے پینے میں کوئی بچار نہیں ہوتا" پنڈتائنی "ان لوگوں کو نفرت بھی نہیں معلوم ہوتی" پنڈت "سب کے سب بھرشٹ ہیں"

رات تو کسی طرح کٹی۔ مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی"

پنڈت جی نے ایک رسی نکالی۔ اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا، اور گھسیٹ کر گاؤں کے باہر لے گئے۔ وہاں سے آکر فوراً نہائے، درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔ ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا نام تھا۔

نرائن دت سہگل پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر لوہاری گیٹ لاہور سے شائع کیا

DUE DATE